

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_226461

UNIVERSAL
LIBRARY

سلسلہء ادارا لمصنفین

نمبر ۲۰

مقالہ روسو

حسین

فرانس کے مشہور قلمی انقلابی ہیرو، روسو

نے

علوم و فنون کے افادی اثرات و نتائج کی تنقید کی ہے

مترجمہ

ماہجرادہ ظفر حسین خان سب ڈپٹی انسپکٹر مدرس سہی پت

باقیام مسعود علی ندوی

مطبع معارف اعظم کٹھ چاٹ شد

۱۹۲۲ء ۶

مقدمہ مترجم

غم عشاق ہو۔ سادگی آموز زبان کس قدخانہ آئینہ ہو ویران مجھ سے
 زوسو کو تعلیم اور سیاسیات کے ساتھ وہی نسبت ہو جو کوپرنکس کو ہینٹ سے اور
 کنیت کو آہیات سے ہو، اس نے بھی، ان دونوں کی طرح، متعارف نقطہ نظر کو کیسرا لٹ
 دیا ہے اور آج دنیائے سیاست و تعلیم کا بیشتر حصہ جو کچھ دیکھتا ہے، روسو ہی کے زاویہ نگاہ سے
 دیکھتا ہے،

دیباچہ کے حدود تفصیل کے تحتل نہیں ہو سکتے، سہ ہر صفت ذیل کی وساطت سے
 روسو کا محض تعارف کر دینا مقصود ہے، اگر ملک و قوم نے چاہا تو آئندہ اس کے اصول تعلیم و
 فلسفہ سیاست مدن کا ترجمہ بھی پیش کش ہو سیکے گا کہ اصل روسو ہی ہے، یہ رسالہ جو اس وقت ناظرین
 کے ہاتھ میں ہے کہنا چاہیے کہ اس کی ایک قلم برداشتہ تحریر ہے جس میں منطقی ترتیب و استدلال پر
 خطیبانہ پیرایہ بیان کو مقدم رکھا ہے، یہ اس کے انوکھے خیالات کا سب سے پہلا مستانہ مضمون ہے،
 اصلاً یہ ایک انعامی مضمون تھا جس کے سر عنوان کا اعلان، فرانس کی ممتاز بزم علمی
 انجمن دیزان کی طرف سے ہوا تھا اور اہل قلم کو دعوت انعام دی گئی تھی، روسو نے، اس کے اندر

مقدمہ مترجم

غم عشاق ہو۔ سادگی آموز زبان کس قد خانہ آئینہ ہو ویران مجھ سے
 روس کو تعلیم اور سیاسیات کے ساتھ وہی نسبت ہو جو کوپرنکس کو ہینٹ سے اور
 کنیت کو آہیات سے ہے، اس نے بھی، ان دونوں کی طرح، متعارف نقطہ نظر کو کیسر اُلٹ
 دیا ہے اور آج دنیا کے سیاست و تعلیم کا بیشتر حصہ جو کچھ دیکھتا ہے، روس ہی کے زاویہ نگاہ سے
 دیکھتا ہے،

دیباچہ کے حدود تفصیل کے تحت نہیں ہو سکتے، بہت صفحات ذیل کی وساطت سے
 روس کا محض تعارف کر دینا مقصود ہے، اگر ملک و قوم نے چاہا تو آئندہ اس کے اصول تعلیم و
 فلسفہ سیاست مدن کا ترجمہ بھی پیش کش ہو سیکے گا کہ اصل روسی ہی ہے، یہ رسالہ جو اس وقت ناظرین
 کے ہاتھ میں ہو کہنا چاہیے کہ اس کی ایک قلم برداشتہ تحریر ہے جس میں منطقی ترتیب و استدلال پر
 خطیبانہ پیرایہ بیان کو مقدم رکھا ہے، یہ اس کے انوکھے خیالات کا سب سے پہلا مستانہ مضمون ہے،
 اصلاً یہ ایک انعامی مضمون تھا جس کے سر عنوان کا اعلان، فرانس کی ممتاز بزم علمی
 ائمن یزان کی طرف سے ہوا تھا اور اہل قلم کو دعوت انعام دی گئی تھی، روسوں نے، اس کے اندر

دل کھول کر علم و فضل کے پرچھے اڑائے اور چونکہ مضمون انجمن کے معتقدات کا چیتھا ہوا اور تھا، اس لئے روس کو مطلق توقع نہ تھی کہ اسے انعام ملیگا، لیکن انجمن ویزان نے مضمون کو قدر کی نظر سے دیکھا اور ۱۷۵۶ء میں روس کو انعام بلا، یہ سب سے پہلا خراج تحسین تھا جو روس نے مشاہیر فرانس سے وصول کیا، یہ رسالہ روس کو انعام پر لے آیا اور اس کی شہرت کا سنگ بنیاد ثابت ہوا، اس کے ایلے خیالات سے واقف ہونے کے لئے تو ناظرین کو رسالہ کے صفحات کی جانب رجوع کرنا چاہیے، یہاں صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ روس کے دل میں عرصہ سے جو مواد یک رہا تھا وہ راہ پا کر اس مضمون میں پھوٹ نکلا، تمدن جدید کے اطوار جو تا متر بناوٹ اور لگاوٹ پر مشتمل ہیں اور فطری سادگی اور سچائی سے خالی ہیں، روس کے فطریں ۱۷۵۳ء سے کھٹک رہے تھے، جبکہ اس کا تعلق وئیس کے سفارت خانہ سے تھا، اور یہ پھوڑا نوک نشتر کا منظر تھا، جو آخر کار انجمن ویزان کے عنوان مضمون نے ہم پہنچا ہی دیا،

اس رسالہ کا شائع ہونا تھا کہ محفل علم و ادب میں ہل چل مچ گئی اور نقباء، علماء، ادباء، غرضکہ ہر طبقہ سے اس کی تردید میں آوازیں بلند ہونے لگیں، حتیٰ کہ شاہ پولینڈ نے بھی گویا اپنے مرتبہ سے اتر کر روس کی تردید میں رسالہ لکھا، لیکن اس تنقیدی لے دے نے روس کے نام کو اور چمکادیا، شاہ پولینڈ کی تنقید نے روس کا تعارف یورپ کے فرمانرواؤں سے کیا، پارلیون کے فتوؤں نے اسے اراکین کلیسیا سے روشناس کرایا، اہل ادب کی نکتہ چینیوں نے، دنیائے ادب میں شہرت دی اور اخبار نویسوں کی چتھاڑنے گھر گھر روس کو نام پہنچا دیا،

لیکن یہ شیرِ مشیرِ حکمت اپنے دل میں خوش تھا کہ اس کی شہرت اور اس کے خیالات کی

اشاعت کا گویا غیب سے سامان ہو رہا تھا، اور اپنے عقاید کی تبلیغ تو وہ سودا تھا، جس کو ہزار
عزتوں کی قیمت پر خریدنے میں بھی اُسے کبھی پس و پیش نہ ہوا،

فنائے راز عشق میں گزرتین سپین لیکن اُسے جتا تو دیا جان تو گیا
اور فطرت کا یہ حاسد و حاجبہ ”فطری انسان“ جس کو تمدن نے زبردستی گود لیکر مصنوعی
انسان بنا دیا ہے، مختلف اسالیب میں روسو کا موضوع قلم رہا ہے، یہاں تک کہ اوس کے فلسفہ
”فطرتیت“ کے زور سے کوئی شعبہ علم محفوظ نہ رہا، کیا تعلیم، کیا سیاسیات، کیا اقتصادیات سب پر
رفتہ رفتہ ”فطرتیت“ چھا گئی،

اجارہ عمرانیہ جو مذہب سیاسیات میں صحیفہ آسمانی کا مرتبہ رکھتا ہے وہ موکتہ آلا رارسالہ ہے
جس میں نظریہ فطرتیت کا رنگ پختہ ہو کر اور نکھر گیا تھا، اوس کی قوت اثر اور حسن قبول کا اندازہ اس
امر سے ہو سکتا ہے کہ انقلاب فرانس اسی کا ایک کرشمہ تھا،

اور جس طرح اجارہ عمرانیہ نے حکومت کے واسطے بس ایک ٹھیکہ دار کی حیثیت مقرر کر کے
شہنشاہیت اور ظلِ اہمیت کے بتوں کو چور چور کر دیا تھا، اسی طرح دنیائے تعلیم کے درمیان،
روسو کا دوسرا نوشتہ ”ایٹل بھونچال بنکر آیا اور قدیم درسگاہوں کی جڑیں ہلا دین، ایٹل ناول کے
پیرایہ میں روسو کے فطری اصولِ تعلیم کا دلکش مرقع ہے اور سچ یہ ہے کہ وہ زبان جس کا دامن ان
جو ابہر سے خالی ہو بڑھی بد نصیب ہے، آج یورپ کی کوئی زندہ زبان نہیں ہے، جس میں اجارہ عمرانیہ
اور ایٹل کا ترجمہ نہ ہو گیا ہو، اور ان کی مقبولیت کا بیسویں صدی عیسوی میں بھی وہی عالم ہے

Social Contract. ۱۷۰۰ء کا نام ہے *Emile*

جو اٹھارھویں صدی عیسوی میں تھا، صرف انگلستان کے متعدد دارالاشاعت مختلف سلسلوں میں اس کے نئے اڈیشن شائع کر رہے ہیں، سچ ہے،

ہرگز نیروان کہ دشمن زندہ شد عبیر عشق ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما
 روسو کے واقعات زندگی تو ایک مستقل تصنیف کے طالب ہیں، اس مقدمہ کے نکلنے سے
 ظن میں کیوں کر سما سکتے ہیں، لیکن ہاں سمندر کو زہ میں بھرا جاسکتا ہے تو کوہ سکتا ہوں کہ شائے میں
 فرانس کو اسکی ولادت کا شرف حاصل ہوا اور دیگر اعلیٰ قابلیتوں کی طرح اس نے بھی افلاس
 کے گود میں پرورش پائی، یعنی جینوا کے ایک گھڑی ساز کے ہاں اسکی روح نے جنم لیا، لیکن آگے
 چل کر تارخ شاہد ہے کہ یورپ پر اس کے قلم کی وہ دھاک مٹھی کہ تخت و تاج تک اس کے سامنے
 لرزان تھے، چنانچہ حکومت وقت کے ہاتھوں وہ بہت ستایا گیا اور اپنے مذہبی و سیاسی عقاید کے
 کارن فرانس سے جلا وطن ہونا پڑا، تعجب و افترا پر وازی کی بن آئی، دشمن کو مغلوب پا کر طرح طرح
 کے افسانے اپنے دل سے گڑھ کر اس کی عصمت پر داغ لگایا، میڈم ڈی ویرن وغیرہ علم دوست
 زمین زاد یون کے نظر لطف کو، جرنلیف دوسرے پیرایہ میں لے اڑے، اور اسے خوب مٹھون کیا
 عربی نے کسی ایسے ہی موقع پر اپنا دل سمجھایا تھا ہے

ستم تہمتِ جہال نہ برباد تو رفت یوسف این را محل شد و مرگم برداشت

اگرچہ روسو نے اپنی زندگی کا سارا کچا چٹھا اپنے "اعترافات" میں خود کھول دیا ہے اور
 اپنی سیرت و کردار کی اخلاقی نکتہ چینی میں دشمن کی صاف گوئی سے زیادہ کام لیا ہے، اور یہ

اخلاقی جرات تسلیم کرنا چاہئے کہ بجائے خود ایک فضیلت اخلاق ہے، لیکن اس کے دشمنوں نے اس کا نامہ اعمال جس قدر سیاہ دکھانا چاہا ہے، اوس میں یقیناً مبالغہ کا شائبہ بیشتر ہے، دیگر علمی مشاغل کے علاوہ، فرانس کی مشہور عالم دائرۃ المعارف کی ترتیب و تالیف کے ساتھ روسو کا تعلق، نیز قابل ذکر ہے،

جلا وطنی کی سزا کاٹنے کے بعد فرانس واپس آیا، لیکن اب حکومت کی سخت نگرانی میں رہتا تھا، اطہار خیالات کو قدم قدم پر پابندی کا سامنا تھا، بات منہ سے نکالنا دشوار تھی، لیکن حریفوں کے دل میں، فرانس کے اندر اس کی خاموش موجودگی بھی کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی!

تفسیر میں گرا چھا بھی بنائیں میر شیون
مرا ہونا بڑا کیا ہے نوا سنجان گلشن کو

اکتا کر انگلستان چلا گیا، جہاں کچھ عرصہ ہیوم کا ہمان رہا اور پھر فرانس کی مٹی نے کھینچ بلایا اور چند روز اور کشاکش دہر جھیلنے کے بعد مشائخ میں آپ کو حکومت کی طرف سے، اور حکومت کو اپنی طرف سے امین کر دیا،

(۲)

روسو، اگر آج زندہ ہوتا تو اس کو اپنی خوش نصیبی پر آپ رشک آتا کہ اگر اس کا اصل رسالہ فرانس کی ایک ممتاز انجمن کی بارگاہِ علم میں مقبول ہوا تھا تو اس کا ترجمہ ہندوستان کی ممتاز بزمِ فضل یعنی داراللمصنفین کی جانب سے شائع ہو رہا ہے،

صید از حرم نشد خم بعد بلند تو

انصاف کا خون ہوگا، اگر اس موقع پر روسو کا مترجم داراللمصنفین کی اس علمی رواداری

کے اعتراف میں، ادائے شکر سے قاصر ہے، اگر دل کا راز بتانا کچھ بچانہ ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ جذبات کا تقاضا تو یہاں تک تھا کہ یہ ترجمہ بانی انجمن ہذا کے نام نامی کے ساتھ منون کر دیا جاتا، لیکن مشکل یہ تھی کہ ”علم“ کے پرچون کا ایک علامہ کی ذات کے ساتھ انتساب، عقیدت مندی کی نظر میں، گویا علم کے دیوتا سے گستاخانہ ٹھٹھول کا، کم از کم، پہلو رکھتا تھا، پس اس احتیاط نے ضبط جذبات فرض کر دیا ورنہ یہ ترجمہ علامہ شبلی نعمانی کے برگزیدہ نام کے ساتھ منتسب کر دیا جاتا،

چند کلمہ مجھے ترجمہ کے متعلق، مختصر، عرض کر دینا ہیں اور بس، اس لیے کہ میں خود اور دوسروں اور ناظرین کے درمیان، زیادہ دیر حال رہنا، پسند نہیں کرتا،

یوں تو ترجمہ نویسی کا گویا یہ ایک فنیشن ہے کہ مترجم اپنے مقدمہ کے کچھ حصہ میں تو زیر ترجمہ کتاب کی مخصوص دشواریوں کا رد و نارد و تاہی اور باقی حصہ، مذہب ترجمہ سے متعلق اپنے خاص انخاص عقاید کی تلقین و تبلیغ میں مصروف کرتا ہے، کرنا تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی ہے، لیکن نہ اس قدر کہ بار خاطر ہو جاؤں، مجھے صرف دو باتیں کہنا ہیں اور بس یہی اس مسئلہ میں میرے رسوخ اعتقاد کی بنیاد ہیں،

۱) ترجمہ کا معیار، مترجم خاکسار کے نزدیک یہ ہے کہ جو کیفیت اصل کے پڑھنے سے ذہن پر طاری ہوتی یعنی وہی کیفیت، ترجمہ کے پڑھنے سے طاری ہو سکے، اس مقصود کے حصول میں مترجم کو پوری آزادی ہے کہ وہ اپنی زبان کی ساخت، صرف و نحو، محاورات کی مناسبت سے، زیر ترجمہ عبارت کے الفاظ کے دروست اور ترتیب میں جو چاہے تصرف کرے، یہ تو آزادی کے حدود ہیں لیکن اس آزادی کے ساتھ پابندی اس امر کی لازم ہے کہ مصنف کے خیالات کے ساتھ اپنے خیالات آمیز نہ کیے جائیں یعنی مصنف کا مفہوم ٹھیک ٹھیک ادا کرنے میں زبان میں جو چاہے تصرف کر لیا جائے

لیکن اس کے خیالات میں تصرف نہ کیا جائے اس لئے کہ دراصل غل ترجمہ یہی "خیال" ہے، نہ کہ زبان۔
 اس نظریہ کی عملی تفریح یہ ہوگی کہ ترجمہ کے اغراض کے لحاظ سے، سموچے جملہ کو خیال کی
 "اکائی" مان لینا چاہیے، نہ کہ جداگانہ الفاظ کو، بلکہ فقرات تک کو نہیں،
 یہ ترجمہ کا آئیڈیل ہے، جو مترجم ہذا کے پیش نظر رہا ہو، لیکن براہ کرم اس کے یہ معنی ہرگز نہ
 لیئے جائیں کہ مترجم کو اس سے کماحقہ عہدہ برآئی کا دعویٰ ہے، یہ قول ہر برٹ اسپنسر کے آئیڈیل
 کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ ایک ایسا اعلیٰ ذہنی نمونہ ہے جو اگرچہ شمع ہدایت کا کام دیتا ہے، لیکن
 خارج میں اوس کا وجود نہیں پایا جاتا،

(۲) دوسری بات قابل گذارش یہ ہے اور یہ ترجمہ کی لائن سے ہٹتی ہوئی، زبان کے متعلق
 ایک عام بات ہے، کہ دورِ جدید کے بعض اہل قلم ٹھٹھت ہندی بزن کے الفاظ کا استعمال اصطلاحی
 مضامین کی پایہ تکنت سے گرا ہوا سمجھتے ہیں، جس کا لازمی وبال، اُردو کی گردن پر یہ آکر پڑا
 کہ جس طح آج کل کے انگریزی خوان میں حصہ انگریزی اور ایک حصہ اُردو ملا کر بولتے ہیں،
 دوسرے فریق نے اس کے جواب میں عربی کی اس قدر بھرا کر کی کہ اُردو کو عربی بنا دیا، اگر
 ایک فریق کہتا ہے تہ رینی ٹینرن نے سارے کام اسٹاپ کر دیئے، تو دوسرا فریق اس کے جواب میں
 بولتا ہے کہ تقاطر امطار علی الانصال مزاحم نقل و حرکت ہے!!

میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اُردو میں عربی کے نئے الفاظ استعمال ہونا بند ہو جائیں،
 ضرور استعمال کیے جائیں، بشرطیکہ کھپ سکیں، اُردو میں ہر زبان کے الفاظ جذب کرنے کی

لے اعلیٰ تحیل نسب امین یا طبع نذر، طہ برسات، طہ بند کردینا،

صلاحیت ہے، مقصود اصلی یہ ہے کہ ہندی نثر اور الفاظ کے ساتھ ”ترک موالات“ کی ادبی پالیسی میں
 ترمیم کی جائے اور ادب کے دائرہ میں بھی ”ہندو مسلم یونٹی“ کا پرچار ہو، چنانچہ اُردو لٹریچر کے لیڈروں
 کے آئندہ پروگرام میں ایک مد ”اچھوت ذات“ کے لفظوں کو فروغ دینا، بھی ہونا چاہیے،
 شاید روسو کے عین مذاق خیال کی بات، یہاں، زبانِ قلم سے نکل گئی،

وارستگی بہانہ بیگانگی نہیں
 اپنے سے کرنے غیرت و حسرت ہی کیوں



وہ سچ

صفحات ذیل، ناظرین کو ایک دل آویز اخلاقی مسئلہ سے روشناس کرائیں گے، فلسفیانہ موشگافیاں جو لٹریچر کے ہر شعبہ کے اندر سرایت کرتی جاتی ہیں اور جن سے ہمارا نصاب تعلیم تک نہیں بچ سکا، میرے موضوع بحث کے خط و خال نہیں ہیں، میرا مقصود اون سادہ و سیدھا حقائق کی تحقیق ہے جو انسانی راحت کی جڑ ہیں،

میں جانتا ہوں کہ میرا دعویٰ ایک ایسا گناہ ہے جو بہ آسانی عفو نہیں کیا جاسکتا، اس لئے اون چیزوں کے خلاف لب کشائی کرنا، جن کو دنیا آج قدر و منزلت کی نگاہ سے دکھتی ہے، اپنے تئیں لعن طعن کا پتہ بنانا ہی، اور بالفرض چند حق شناسوں کی تحسین اگر نصیب بھی ہوئی تو اس سے عام پھینکار کی تلافی نہیں ہو سکتی، لیکن میں انشاء اللہ اپنے مقام پر ثابت قدم رہوں گا، مجھے عالم و جاہل، کسی کے خوشنود ہی مزاج کی پردہ نہیں ہے، ہمیشہ انسان اپنے گرد و پیش کے متداول و رائج عقائد کا اسیر ہوتا ہے اور آج کل کے فلسفی و آزاد خیال اگر انجمن (اعتساب) کے زمانہ میں ہوتے تو وہ بھی مذہبی جوش و تعصب میں کسی سے پیچھے نہ ہوتے، پس وہ اہل قلم جو اپنے عہد کے بعد بھی جینے کا آرزو مند ہے، اس کو چاہیے کہ ہم عصروں کے واسطے لکھنے کا خیال چھوڑے، ایک بات اور کہتا ہوں اور بس، چونکہ مجھے اس کا وہم بھی نہ تھا کہ یہ مضمون شرت

قبولیت و انعام حاصل کرے گا، لہذا میں نے اس کو بھیجدینے کے بعد بہت کچھ گھٹا، بڑا دیا تھا اور وہ گویا ایک بالکل نئی تصنیف بن گیا تھا، لیکن بحالات موجودہ میرا فرض ہے کہ میں اسکو اسی شکل میں شائع کروں، جس شکل میں اس نے انعام حاصل کیا تھا، چنانچہ مجنبہ پیش نظر ہے، سوائے چند نوٹوں کے اضافہ اور دو جگہ تبدیلیوں کے حذف کے جو بیک نظر معلوم ہو جاتی ہیں اور جن کو غالباً، اکاڈمی پسندیدہ نظر سے نہ دیکھتی ہوگی..... تعظیم، اتمان اور انصاف، جن کی جماعت ہذا مستحق ہے، میرے خیال میں اس امر کے مقتضی تھے کہ میں اس بات کو بیان ظاہر کروں



علوم و فنون کے اخلاقی اثرات

ایک نظر

میرے سامنے سوال یہ ہے کہ علوم و فنون کی ترویج و تجدید کا اثر اخلاق پر کیا پڑا، آیا ان کے ذریعہ سے ہمارے اخلاق میں جلا اور صفائی پیدا ہوگئی، یا الٹی کثافت اور خرابی آگئی؟ میں کس پہلو کو اختیار کروں؟ صاحبو! مجھے وہ پہلو اختیار کرنا چاہیے جو ایک ایسا نادر آدمی کو زیبا ہی، جس کو اپنے جہل کا احساس ہو، اور جو باوجود جہل و نادانی، آپ کو کسی سے ہینا نہیں سمجھتا ہے،

مجھ کو، اس عدالت کے سامنے جس کے ہاتھ میں میری قسمت کا فیصلہ ہے، اس موضوع پر کما حقہ بحث و نظر کے مشکلات کا اندازہ ہو، میں علمائے یورپ کی جلیل الشان جماعت کی تحقیر کس طرح کروں؟ اور علم و فضل کی اس حقارت کو جو میں اپنے دل میں رکھتا ہوں، اس عزت کے ساتھ جو حقیقی علمائے واسطے واجب ہے، کس طرح بنا ہوں؟

نکتہ چین ہے، غمِ دل او سکونستائے زبنے گیا بنے بات جہان بات بنائے نہ بنے
مگر مجھ کو کس بات سے خوفزدہ ہونا چاہیے؟ آیا مجھ کو اس جماعت کی نکتہ سنجی

اور شرف نگاہی سے دُنا چاہیئے جس کے سامنے میں اپنے خیالات کی وکالت کے لیے کھڑا ہوا ہوں؟ میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ خوف کا مقام ضرور ہے، لیکن دراصل میں اپنی عبارت کی خامیوں کی وجہ سے خائف ہوں نہ کہ اپنے خاص خیالات کی وجہ سے، عادل سلاطین نے مشکوک مقدمات میں، اپنی عرضی کے خلاف بھی فیصلہ دیدیئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ایک سچے دعویٰ کے واسطے اس سے بہتر اور کون سا موقع ہو سکتا ہے کہ وہ منصف اور روشن خیال عدالت کے روبرو پیش ہو جس کو اپنی ذات کے خلاف حکم دینے میں بھی تامل نہیں ہو سکتا ہے،

اس خیال نے میری ڈھارس باندھی اور اس خیال میں ایک خیال اور آکر ل گیا جس نے مجھے بالکل آمادہ کر دیا اور وہ یہ خیال تھا کہ چونکہ میں اپنے مقدمہ پر بھرتی کی حمایت کے واسطے کھڑا ہوا ہوں، لہذا ظاہری کامیابی خواہ کچھ ہو، میں ایک انعام سے کسی حال محروم نہیں رہ سکتا اور یہ انعام وہ ہے جو بہر حال صورتاً اپنے حق ضمیر سے مجھے ملے گا،

حصہ اول

یہ کیسا پر عظمت و نظر فریب منظر ہے کہ انسان، اپنے آپ کو، اپنی کوشش کے ہاتھوں
 گو "انیت" کی پستی سے "ہست" کی بلندی پر لیجاتا ہے، اور ایسی عقل کی روشنی سے، ان غلیظ
 بادلوں پر غالب آتا ہے، جن میں فطرت نے اُسے لپیٹ دیا تھا، وہ بسا اوقات، انسانیت
 کے انتہائی نقطہ سے بھی اونچا نکل جاتا ہے اور اپنے خیالات کے پروں پر اڑ کر بلا اعلیٰ تک پہنچتا ہے
 آفتاب کی طرح اپنے طویل قدموں سے وسعت آباد عالم کی سیر کرتا ہے اور سب سے زیادہ
 حیرت و استعجاب کا مقام وہ ہی جبکہ وہ اپنے اندر واپس آ کر "انسان" "انسانیت" "فرائض"
 اور "مال حیات" کا مشاہدہ کرتا ہے، ان تمام معجزات کا ظہور اگلی قرون میں بارہا ہو چکا ہے،

آدمی زادہ طرفہ معجونیت

از فرشتہ سرشتہ در حیوان

گر کند میل این شود کم ازین

در کند قصد آن شود بہ ازان

عہد قدیم میں یورپ پر وحشت چھائی ہوئی تھی اور دنیا کے اس ٹکڑے کے باشندہ

جو آج اس قدر روشن خیالی کا دم بھرتے ہیں، چند صدیاں اُدھر، ایک ایسی حالت میں

ڈوبے ہوئے تھے جو جہالت سے بدرجہا بدتر تھی۔ علمی بکواس جو جہل سے کمین زیادہ نفرت

انگیز ہے، علم کی سلطنت کو دبا بیٹھی تھی اور اس کو معزول کر کے، علم کو اس کا جائز

حق دلانا، قریباً محال ہو گیا تھا،

حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ ایک ایسے مکمل انقلاب کی ضرورت محسوس ہوتی تھی جو انسان کی گم شدہ معمولی سمجھ کو واپس دلا دے، چنانچہ سیلاب آیا اور اوس طرف سے آیا، جدھر سے آنے کا وہم و گمان بھی نہ تھا، نادان مسلمان نے جو علم و فضل کے حق میں ایک دائی تازیانہ ہے، ہمارے اندر ایک نئی روح پھونک دی، قسطنطین کے سر سے تاج کا گرنا تھا کہ قدیم یونان کی یادگارین اٹلی میں آگئیں بعد ازاں اس گرانقدر مالِ غنیمت نے فرانس کو مالِ مال کر دیا، ادب کے چھپے پیچھے ”علوم“ کا قافلہ آیا اور تحقیق و اجتہاد نے انشا پر وازی سے ہاتھ ملایا، یہ ترتیب عجیب ضرور معلوم ہوتی ہے، لیکن شاید یہی نہایت قدرتی ترتیب ہے، دنیا نے شعر و سخن کی دیوی سے رسم و راہ کھولی، بنی نوع انسان کے دل میں ایک دوسرے کو خوش کرنے کا ولولہ پیدا ہوا اور فلسفہ ساری کا بیج بویا گیا، روح اور جسم کے ضروریات جدا گانہ بنیں، جسمانی ضروریات سوسائٹی کی بنیاد ہیں، اور روحانی حاجات اس کا زیور ہیں، جب تک حکومت و قانون، رفاہ عام اور امن عامہ کی ضمانت رہتی ہیں، اس وقت تک علوم و فنون اور ادبیات کا جوڑ عیان نہیں ہوتا، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ان کی قوت اور اثر منفقود ہوتا ہے، تعلیم، گرانبار طوقی و زرخیر کو پھولوں کے ہار ڈال ڈال کر چھپائے رکھتی ہے، آزادی کے نظری احساس کا جو انسان کا پیدائشی حق ہے، اس کے سینہ ہی میں گلا گھونٹ کر خاتمہ کر دیتی ہے اور غلامی کا گرویدہ بنا دیتی ہے، مختصر یہ کہ قوم کو اس بلند درجہ پر پہنچا دیتی ہے جس کو عورت عام میں تمدن اور تہذیب کہتے ہیں،

ضرورت نے شاہی تخت بچھائے، علوم و فنون نے ان کو پائدار کیا، سلاطین ہمیشہ کمال اور صاحب کمال کی قدر و پرداخت اور تفریح و طرب و لہو لعب کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور اس میں ادن کی دو بڑی مصلحتیں مضمر ہوتی ہیں، اول تو یہ کہ ان تمام مشاغل کے اثر نظر کی سمٹ سمٹ کر ایک تنگ دائرہ میں محصور ہو جاتی ہے، دوسرے یہ کہ غیر فطری و مصنوعی ضروریات کے جال میں قوم پھنس کر پرانی زنجیروں پر گویا صد ہائی زنجیروں کا اضافہ کر لیتی ہے۔ سکندر نے مفتوحہ قوم سے ماہی گیری کا پیشہ چھڑوا کر، تمدن اقوام کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا تھا،

امریکہ کے وحشی جو برہنہ پھرتے اور شکار پر بسر اوقات کرتے ہیں، آج تک محکومیت کی تلخی سے نا آشنا ہیں، اصل یہ ہے کہ اوس شخص کے کا ندھے پر کوئی جو انہیں رکھ سکتا، جس کو کسی شے کی حاجت ہی نہ ہو، معاشرت جدیدہ کے دلفریب رخ کے خط و خال، مذاق سلیم کی نزاکت و نفاست، خندہ پیشانی، گرمی تپاک، حس و تواضع، بالفاظ مختصر یوں کہو کہ مصنوعی محاسن اخلاق کی نمائش اور اصلی مکارم اخلاق کا نقدان ہے،

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب، کہ دل دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

نئی روشنی کے دلدادہ، ان مزخرفات کو تمہتی جو اہر تصور کرتے ہیں اور خوش وقت و خوش باش غلاموں کی جانب سے گرانقدر عطیہ سمجھ کر سر چڑھاتے ہیں،

”کمالات“ جس قدر بناوٹ سے خالی ہوتے ہیں اسی قدر پرکشش ہوتے ہیں، ایٹھنر اور رومہ اپنی عظمت و شان کے پر فرزند میں، انہی کمالات میں ممتاز تھے، زمانہ حال کے آثار

دیکھتے ہوئے ظن غالب ہوتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں تمام گزشتہ عہدوں پر بازی لیجا لیگا فلسفیانہ انداز بیان نہ کہ علیّت کا بھدا اظہار، قدرتی دلنشین کلام (جو طیو طانی بھونڈے پن سے پاک اور اطالیانہ اشارات و کنایات سے معرّی) یہ وہ خوبیاں ہیں جو وسعت نظر اور تجربات عالم سے پیدا ہوتی ہیں، ہم سے سابقہ اور معاملہ رکھنے والوں کے واسطے، کیسی مسرت کا مقام ہوتا، اگر ہمارا ظاہر ہماری باطن کا سچا آئینہ ہوتا، اگر تہذیب نیکی بھی ہوتی، اگر ہمارا قول ہمارا فعل بھی ہوتا، اور اگر ادعا و فلسفہ، حقیقی فلسفہ بھی ہوتا، لیکن اتنے اوصاف کا ساتھ ساتھ پایا جانا، فی الجملہ دشوار ہے، علاوہ برین ”نیکی“ کی سواری کے ساتھ، ماہی مراتب اور نمائشی جلوس نہیں ہوتا،

لباس کی بھرک دولت مندی کا اعلان کر سکتی ہے اور شگفتگی کلام، مذاق سلیم کا، لیکن تہذیبی اور مردانگی کی شناخت، دوسری علامتوں سے کی جاتی ہے، طاقت و توانائی، مصاحبین سلطنت کے زربفتی خلعت کے نیچے نہیں بلکہ مزدور کے اوس موٹے کرتے کے اندر چھپی ہوئی لیگی جس کا موٹا کھدر اوس کے گھر بنا گیا ہے،

نیکی روحانی توانائی کا نام ہے، اور ہر طرح کی آرائش و زیبائش اس کی اصلیت سے دور ہے، ایسا نہ کہ ایک پہلوان ہے جو کشتی لڑتے وقت برنگی کو پسند کرتا ہے اور قیمتی لباس کو جس کا مقصد کسی جسمانی عیب کو چھپانا ہوتا ہے، حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے کدوہ آزادانہ داؤچ کرنے میں ہار جاتا ہے، قبل اس کے کہ تصنع نے ہمارے اطوار کو اپنے سانچے میں ڈھالا، اور ہمارے جذبات کو بناوٹی بولی سکھائی، ہمارے اخلاق اگرچہ ناہموار تھے، لیکن فطری اور سچے تھے، اور ہمارے

طرز عمل نے ہمارے طبائع کا پتہ بیک نظر چل جاتا تھا، انسانی فطرت اوس وقت میں بھی کچھ خوب نہ تھی جیسا کہ اب ہے، لیکن آسانی یہ تھی کہ شخص ایک دوسرے کو آئینہ کی طرح دیکھ سکتا تھا اور غلطی نہیں و فریب کا کوئی اندیشہ نہ تھا اور اس وجہ سے انسان بہت سی برائیوں سے از خود بچ جاتا تھا، فی الحقیقت یہ ایک بہت بڑی برکت تھی، جس کے فوائد کو ہم آج محسوس نہیں کر سکتے،

فی زمانہ علمی موٹنگا فیون اور مذاق کی لطافت نے ملکہ "تفریح" کو ایک مستقل فن بنا دیا ہے، اور اگرچہ بظاہر ہمارے آداب و اطوار اُصول کے پابند نظر آتے ہیں، لیکن نامیسی اُصول پرستی کا مایہ خمیر سر تا سر مکرو فریب ہے، ہر دماغ ایک ہی سانچہ میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے، تہذیب یہ چاہتی ہے، سلیقہ یہ کہتا ہے، غرض کہ ہر رسم پابند قاعدہ اور پھینشن پابند قانون ہے، جس سے سرتابی کی کسی کو مجال نہیں ہو سکتی، برخلاف اس کے احکام فطری کی ایک ایک کر کے خلاف ورزی کی جاتی ہے،

ہم کبھی اپنی اصلی حالت کو ظاہر کرنے کی جرات نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ اپنے تئیں رسمی بندشوں میں جکڑا رکھتے ہیں اسی طرح انسان کا وہ گلہ جس کو سوسائٹی کہتے ہیں مقررہ اوقات پر مقررہ کام انجام دینے کے بعد، آپ کو فرض سے بسکدوش تصور کرتا ہے، یکسان مواقع پر ہر فرد سے یکسان اعمال سرزد ہوتے ہیں، تا وقتیکہ کوئی قوی محرک مانع عمل نہ ہو، چنانچہ ہمیں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ آخر ہمارا سابقہ کس سے ہے، حتیٰ کہ احباب کو بھی اوس وقت تک نہیں پہچان سکتے جب تک کہ بُرا وقت نہ آکر پڑے، یعنی بعد از وقت صحیح شناخت ہوتی ہے، اسلئے کہ ایسا موقع پیش آنے سے قبل ہم کو معلوم ہو جانا چاہیئے تھا کہ کون ہمارا دوست ہے اور کون دشمن، بعد کو پتہ چلا تو کیا ہوا،

شک و تذبذب کی یہ حالت، کمزور و غامض ایک سلسلہ قائم کر دیتی ہے اور سچی دوستی جھٹکتی

عزت، کمال بھروسہ خیر باد کہہ جاتے ہیں، حسد، دوسواس، اندیشہ، بے ہنری، خاموشی، نفرت اور دھوکا، خندہ پیشانی کے پر فریب بھیس میں اپنی اصلیت چمپا کر اور دکھا دے کی صاف گوئی و خوش خلقی کا روپ بھر کر، ہمارے سامنے آتے ہیں، نمائشی صاف دلی اور مصنوعی سادگی کے ہاتھ میں ہمارے زمانہ کی باگ ہے، بے محل قسم کھانا گناہ سمجھا جاتا ہے، لیکن بہت سی کفر گوئیوں میں جو ہمارے مذہب کے قانون کو ناگوار نہیں ہوتیں، ہم خود تو ازراہ کسارت اپنی تعریف اپنے منہ سے کرنا عیب سمجھتے ہیں، لیکن دوسروں کا مضحکہ اڑانے میں کچھ مضایقہ نہیں سمجھتے؛ دشمن کو بھی اوس کے منہ پر بڑا کھنا تازیبا سمجھا جاتا ہے، لیکن پیٹھ پیچھے بڑا کھنے میں گویا کوئی ہرج نہیں ہے؛ دوسری قوموں سے تعصب ہمارے دل سے اٹھتا جاتا ہے، لیکن اوس کے ساتھ حُب الوطنی کا جذبہ بھی زائل ہوتا جاتا ہے، جہالت ذلیل نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، لیکن اس کی جگہ تشکیک کا اختیار کر لیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض بڑا ایمان برمی نظر سے دیکھی جاتی ہیں اور بعض کی جانب نفرت و اکراہ کا اظہار کیا جاتا ہے؛ لیکن ساتھ ہی بہت سے معائب ہیں جن کو محاسن اخلاق کا مرتبہ دیا جاتا ہے، اور جن کو اختیار کرنا یا کم از کم ظاہر داری کے طور پر برتنا ضروری سمجھ لیا گیا ہے، عصر جدید کے اون "نیک بندوں" کی مدح سے جس کا جی چاہے رطب اللسان ہو، لیکن مجھے تو ان کا زہ ایک مہذب رندی اور اور ان کا تقویٰ ایک شایستہ مستی نظر آتا ہے، جو میرے خیال میں اسی قدر ذلیل ہے جس قدر اون کی مصنوعی سادگی، مان میں کا قول ہے کہ میں بخت گفتگو پسند کرتا ہوں لیکن گنے چنے انشاخص

کے ساتھ، اس لئے کہ اُمرا کی تفریح یا اپنی قابلیت کے اظہار کے قصد سے کلام کرنا کسی غیور و متین آدمی کا کام نہیں ہے۔

الغرض ہمارے اخلاق کی یہ خوبیاں ہیں اور ہمارے محاسن کی یہ اصلیت، علوم و فنون کا دعویٰ ہے کہ اس تمام کار خیر کا سرانجام، اس کے دم سے وابستہ ہے، مین نہایت خوشی کے ساتھ اس امر کو تسلیم کیے لیتا ہوں، لیکن ایک بات پوچھنا ہوں وہ یہ کہ آیا کسی غیر ملک کا باشندہ یورپ آ کر اس کے اخلاق کی نسبت صحیح رائے قائم کر سکتا ہے یا نہیں، علوم کی اشاعت، فنون کا چرچا، عام ضیافتوں کا سلیقہ، ملاقات کی گرجوشی، کلام کی نرمی، تواضع، لطف و کرم کی بھرمار اور ہر طبقہ کے افراد کا صبح سے لیکر شام تک ایک دوسرے کو ممنون کرنے کی فکر میں لگا رہنا، ان تمام مناظر کو دیکھ کر کیا کوئی ہمارے اخلاق کی اصلیت کو پہنچ سکتا ہے؟

جہاں نتیجہ کا وجود نہ ہو، وہاں "سبب" کی تلاش عبث ہے، لیکن یہاں نتیجہ موجود اور بد اعمالی اظہار من لشمس ہے، جس قدر علم و فن میں ترقی ہوئی، اسی قدر اخلاق بگڑتے اور گندے ہوتے گئے، کیا یہ بد قسمتی موجودہ زمانہ کے واسطے مخصوص ہے؟ نہیں، حضرات یہ تمام سینات جو بے سود عالمانہ اکتشاف و تحقیق کی سرگرمیوں سے پیدا ہوتے ہیں، اس عالم ارضی کے ہم عمر ہیں، سمندر کا مد و جزر اس قدر انضباط اور باقاعدگی کے ساتھ ماہتاب کا تابع نہیں جس قدر انسانی اخلاق، علوم و فنون کے پنجہ میں بے بس ہیں، جب جب علم و ادب کی روشنی انسانی افق پر نمودار ہوئی ہے، نیکی پر وازہ گر گئی ہے اور یہ تماشہ بلا استثناء ہر ملک اور ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے،

مثال کے لئے مصر کو لو جو تہذیب و تمدن کا سب سے پہلا مدرسہ ہے اور اپنے روشن آسمان

نظر میں ایک مضحکہ خیز مقام، بن گئی، چنانچہ اس ملک کے گردن میں طوقِ غلامی آکر پڑا، جس نے ہمیشہ دوسروں کو اپنے حلقہٴ غلامی میں داخل کیا تھا، اس کے زوال کا دن وہ شام تھی جبکہ اوس نے اپنے شہریوں میں سے ایک کو "مفتی مذاقِ سلیم" کا خطاب عطا کیا تھا، اب میں مشرقی سلطنت کے اوس پایہ تخت کی نسبت کیا کہوں جو اپنی مقامی شان و شوکت کے اعتبار سے دنیا کا دار الحکومت کہلانے کا مستحق ہے، جو ادنِ علوم کا ماوا اور بلجا بنا، جن کو یورپ کی وحشت و جہالت، نہیں بلکہ اوس کی فراست و دوراندیشی نے شہر بدر کر دیا تھا، فاحش بدکاریاں، حیا سوز بد معاشیاں، سنگین جرائم، سازشیں، قتل اور خونریزیوں، قسطنطنیہ کا تار و پود بن گئی تھیں، یہ حال تھا اوس شفاف سرچشمہ کا جس میں سے علم و فضل کے سیلاب اُبھے ہیں اور جس پر نشاۃِ جدیدہ کو اس قدر فخر و ناز ہے،

اور اس کی کیا ضرورت ہے کہ حق کا ثبوت قرونِ ماضیہ کی تاریخ کے صفحات میں تلاش کیا جائے، جبکہ زمانہ حال کے پاس وافر شہادت موجود ہے، ایسا بھی ایک وسیع سلطنت ہے، جہاں علم کا احترام کیا جاتا ہے اور جہاں علم کے ذریعہ معزز عہد و بن تک رسائی ہوتی ہے، اگر علوم، اخلاق کو ترقی دے سکتے ہیں، اگر علم سے ہمارے اندر شجاعت، حب الوطنی اور ایثار کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں تو اہل چین کو آج سب سے زیادہ فہمیدہ اور سب سے پہلے آزاد اور ناقابلِ تسخیر ہونا چاہیے تھا، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ کوئی معیوب نہیں، جس کا داغ اودن کے دامنِ اخلاق پر نہ ہو، کوئی جرم نہیں، جس کے وہ مرکب نہوں، جبکہ وزراء کی فراست، قانون کی ہمہ گیری اور جمہور کی وسیع آبادی چین کو جاہل اور شقی تا تاریخوں کے حملہ سے بچا سکی

تو علم و ادب کی یہ ساری کائنات، آخر کس دن کے کام آوے گی، ملک کو ان خطابات سے کیا نفع پہونچا جو علماء کو بخشے گئے تھے، کیا اس کا منشاء یہ تھا کہ پاجیون اور غلامون کی نسل پھیلے اور پھولے؟

اس کے مقابلہ میں ان اقوام کے اخلاق پر ایک نظر ڈالو، جو بیکار علم و فضل کی چھوت سے بچکر، اپنی نیکی کے بل پر آج سب سے زیادہ سرور اور سب سے زیادہ مطمئن ہیں، یہ اقوام فی الحقیقت دنیا کے سامنے ایک بہترین قابل تقلید نمونہ پیش کرتی ہیں، اس قبیل کی ایک قوم ایرانیون کی تھی جس کو نیکی کی تعلیم اس اہتمام سے دی گئی تھی، جیسا کہ آج ہم کو علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی ہے، اس قوم نے ایشیا کو بات کھتے مغلوب کر لیا اور اس امر کا افتخار تھا اس قوم کو حاصل ہے کہ اس کی سیاسی تاریخ گویا ایک فلسفیانہ افسانہ ہے۔ یہی حال قابل صدمہ سائیدین نسل کا ہے اور یہی کیفیت جو نمون کی ہے، جن کی سادگی عفت اور سعادت کا بیان، مورخ کے قلم کے واسطے جو دشمن خیال، دو لہند اور عیش پسند اقوام کے خباث کھتے کھتے اکتا گیا ہو، آسودگی بخش ہے، یہی حال افلاس اور جہالت کی حالت میں رومہ کا تھا اور یہی حال ہمارے زمانہ میں اون وحشی قبائل کا ہے، جن کی مشہور زمانہ شجاعت کو کوئی مصیبت زیر نہیں کر سکتی اور جن کی عصمت کو کوئی تحریش گندہ نہیں کر سکتی، میں اون خوشحال قومون کے تذکرے کی ضرورت نہیں سمجھتا جو بہت سی برائیوں کا بحرن کے دبانے میں ہمیں بڑی دشواری پیش آتی ہے، نام تک نہیں جانتے تھے، دور کیوں جاؤ، امریکہ کے وحشی کو لو، جس کی سادہ اور قدرتی طرز حکومت کو مان میں اسلاطون کی

سیاسیات ہی پر نہیں بلکہ ان تمام خوبوں پر فلسفہ نے دیکھے یا جن کی حکمت نے تعبیر دی ہے، ترجیح دیتا ہے، ان لوگوں نے اپنے مشاغل مفیدہ کو دماغی ریاضت پر نادانستہ ترجیح نہیں دی تھی، بلکہ وہ خوب جانتے تھے کہ دوسرے ملکوں میں میاں اخلاق اور ماہیت خیر و شر کی بیکار بحثوں میں وقت ضائع کیا جاتا ہے، اور از کار رفتہ حکما، اپنے منہ سے اپنی تعریف اور دوسروں کی مذمت کرتے ہیں، جن کو انھوں نے وحشی کا لقب دے کر نکو بنا رکھا ہے لیکن ان ”وحشیوں“ کی نظر سے ان حضرات کے اخلاق پوشیدہ نہ تھے اور وہ جانتے تھے کہ ان کے علم و فضل کی حقیقت کیا ہے،

(من خوب می شناسم پیران پارا)

کیا تاریخ اس شہر کو فراموش کر سکتی ہے جو یونان کے قلب میں آباد تھا اور اپنے باشندوں کی مبارک جہالت اور قانون کی دانائی کے واسطے شہرہ آفاق تھا، یہ گویا دیوتاؤں کی جمہوری سلطنت تھی نہ کہ انسانوں کی، ان کے فضائل انسانیت کے درجہ سے بہت بالاتر تھے، جس وقت رذائل، فنون لطیفہ کی سرکردگی میں ایتھنز کے رگ و پے میں سرایت کرتے جاتے تھے، جبکہ وہاں کا ظالم حکمران، ملک الشعراء، ملک کا کلام جمع کر رہا تھا، اسپارٹا جو علم کے غور سے پاک تھا، اپنے پاس فن اور اہل فن، علم اور اہل علم کو پھینکنے نہیں دیتا تھا،

ان دونوں کے درمیان جو باہمی فزق تھا، بالآخر سامنے آ گیا، ایتھنز ذوق سلیم و تہذیب کا مرکز بنا، جس کی خاک سے بڑے بڑے فصحا اور حکماء اٹھے، اس کی عمارتوں کی

خوبی و نفاست اور زبان کی بلاغت و شستگی نے چار دانگ عالم سے خراج تحسین وصول کیا، شہر میں ہر چہار جانب، ہنرمند مصورین نے گویا پتھر اور کپڑے میں جان و ہیبتی، ایتھنٹر ان تمام حیرت افزا کارناموں کا یاد آور ہے، جن سے ہر گڑھے ہوئے زمانہ میں سبق حاصل کیا جاسکتا ہے، لیکن ایسی ڈیمین کی تصویر کا یہ آب و رنگ نہ تھا، وہ بقول اپنی ہمسایہ اقوام کے نیکون کی بستی تھی، جہاں ہوا کے ساتھ نیکی سانس کے اندر جاتی تھی، اس کے باشندوں نے اپنی شجاعت کے کارناموں کے علاوہ کوئی دوسری یادگار نہیں چھوڑی، لیکن یہ بجائے خود ایک ایسی یادگار ہے جو باریک بین نظر کے آگے، ایتھنٹر کی پتھریلی یادگاروں سے کہیں زیادہ برتر و قیمتی ہے،

اس میں شک نہیں کہ ایتھنٹر میں خال خال ایسے نفوس بھی تھے، جنھوں نے زمانہ کے طوفان کا مقابلہ کیا اور اپنے خیالات کو مصوری و شاعری کے پرستان کے درمیان بھی پاکیزہ رکھا، پناہ خانہ انہیں سے ایک ممتاز ترین لیکن بد قسمت شخص کی رائے سنو جو اس نے ہم عصر ارباب علم و فن کی نسبت قائم کی تھی،

”میں نے شعرا کی حالت پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ ادن کی قابلیت خود ادن کو اور دوسروں کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہے، وہ اپنی نازک خیالی کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں اور اس میں فی الجملہ کامیاب بھی ہوتے ہیں، لیکن اصلیت بہت جلد بے نقاب ہو جاتی ہے“

آگے چل کر سقراط لکھتا ہے: ”شعرا کے بعد، میں مصوروں کی جماعت کی طرف متوجہ ہوا، مجھ سے زیادہ جاہل، اور علم و فن سے کورا کوئی نہ ہوگا، لیکن مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا، کہ وہ بھی شعرا کی طرح غلط راستہ پر پڑے ہوئے ہیں اور دونوں ایک ہی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں،“

چونکہ سب سے زیادہ مشاق ہاتھ اپنے ہم چشموں پر سبقت لیجاتا ہی پس وہ خیال کرنے لگتا ہے کہ دنیا کی ساری عقل و دانش اسی کے حصہ میں ہے، اس تکبر نے اون کو میری نظر سے گرا دیا، پس میں نے اپنے دل سے اس طرح استفسار کیا، جیسا کہ کوئی کسی دیوتا سے استخارہ کرتا ہے کہ آیا مجھے اپنی موجودہ حالت پر فناء کرنا چاہیے یا اون کے مثل بننے کی سعی کرنا چاہیے، کیا مجھ کو وہ جاننے کی کوشش کرنا چاہیے جو وہ جانتے ہیں یا اپنی جہالت پر قانع رہنا چاہیے، میرے قلب نے گواہی دی کہ میری موجودہ حالت قابل ترمیم ہے،

”سوفسطائی، نہ شعرا، نہ خطبا اور نہ میں، کوئی بھی نہیں جانتا کہ حق، حیر اور جہال کی ماہیت کیا ہے، لیکن میرے اور اون کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتے اور جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں اور میں کچھ نہیں جانتا لیکن یہ جانتا ہوں کہ کچھ نہیں جانتا، بہ طور مجھے طبیعت کے ساتھ اپنی لاعلمی کا تو علم ہے، اور الگمانت نے جو میرے عقل کی فضیلت کو سراہا ہے، اس کا نشاء اس کے سوا کچھ نہیں کہ مجھ کو اون امور سے متعلق جو میری واقفیت سے باہر ہیں، لاعلمی کا کامل اعتراف ہے۔“

الغرض تم نے دیکھا کہ سقراط جو دیوتاؤں کے نزدیک عاقل ترین انسان اور یونانیوں کی رائے میں ایک جید عالم تھا، کس قدر جہل کا معترف ہے اور اگر آج بھی وہ ہمارے درمیان، بقید حیات ہوتا اور علمائے عصر اس کو اپنا ہم خیال بنانے میں ایڑھی چوٹی کا بھی زور لگا دیتے، تو بھی صاحبو! یہ دیانت کا پہاڑ، اپنی جگہ سے نہ ہٹتا اور اون کی علمی خرافات کو حقارت کی نظر سے دیکھتا، کتابوں کا غدی سیلاب جو ہر چار جانب سے آ رہا ہے، سقراط کے سر و امن کو بھی تر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، اور جس طرح وہ اپنی اتباع کی ہدایت کے واسطے اپنے فضائل و خصائل کی محض یاد

چھوڑ گیا تھا، اسی طرح ہمارے واسطے بھی چھوڑ جاتا اور سچ یہ ہے کہ نبی نوع انسان کی تعلیم کا ہی ایک بہترین طریقہ ہے،

سقراط نے ایتھنز میں اور کیتو اگبر نے روم میں یونانیوں کے کرد و فریب کے خلاف جنھوں نے اپنے ہم وطنوں کے اخلاق و مردانگی کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، جہادِ عظیم شروع کر دیا تھا، اس عہد میں بزمِ خویش، نام نہاد تہذیب و تمدن کا دور دورہ تھا، رومہ، حکما و نصحا سے لبریز تھا، لیکن فوجی ضبط و انصرام مفقود تھا، زراعت سے غفلت کی جاتی تھی، باشندہ قبیلوں میں تقسیم ہو کر اپنے ملک کو بھول گئے تھے، آزادی، اثبات اور اطاعت کے مقدس ناموں کی جگہ اپیکورس، زینو اور آرسیسی لاس نے چھین لی تھی، حتیٰ کہ خود اس عہد کے فلاسفہ کا یہ قول تھا کہ جب سے علم کا ظور ہوا، ایمان داری کے آفتاب کو گھن لگنا شروع ہو گیا، اگلے زمانہ میں رومی، نیک اور پارسا ہوتے تھے، لیکن جب سے انھوں نے پارسانی کا مطالعہ شروع کیا، پارسانی کا خاتمہ ہو گیا،

اگر فابریشس، جس کے دست و بازو کی قوت نے رومہ کو تباہی سے بچایا تھا، اور جس کی ساری شہرت ملکی فتوحات سے کہیں زیادہ، اس شخص کے نام کے ساتھ انساب سے ہو، مگر شخص آج کسی طرح دوبارہ زندگی پا کر ہمارے درمیان آجاتا اور رومہ کی موجودہ شان و شوکت دیکھتا تو بمیسا ختہ چُحُ اُٹھتا کہ اے خدا! وہ چھپر وہ دیہاتی آتش دان کیا ہوئے جو پہلے زمانہ میں نیکی کا نشین تھے، رومی سادگی کی جگہ یہ کیسا ہولناک بناؤ چھایا ہوا ہے؟

۱۸۷۵ء تیسری صدی قبل مسیح کا سالار لشکر اور مدبر،

یہ غیر زبان کمان کی ہی؟ یہ زمانہ انداز کیسے ہیں؟ یہ بت، یہ تصویریں یہ مرتبہ یہ عمارتیں کمان سے
 آئیں؟ احمقو! تم نے یہ کیا کیا؟ تم جو کرہ ارض کے آقا تھے، اپنی مفتوحہ چھپوری قوموں کے
 دام میں پھنس کر خود اداؤں کے غلام بن گئے ہو! خطیب اور مقرر تم پر حکومت کرتے ہیں!
 افسوس! کیا تم نے یونان اور ایشیا کی زمین کو اپنے خون سے اس لئے سینچا تھا کہ معماروں،
 مصوروں، سنگ تراشوں، اور تھیٹر کے ایکٹروں کا دوزخ شکم بھرے؟ قرطاجہ کا مال غنیمت
 بائسری بجانے والے کو بطور انعام بخشا جاتا ہی! اسے اہل رومہ اسی میں خیر ہی کہ اپنے تھیٹر کو
 ڈھا دو، تہوں کو توڑ ڈالو، تصویروں کو جلا دو، اور اپنے درمیان سے اداؤں کی زندگیوں کو نکال باہر
 کرو، جن کے ممالک ہنر تمہارے اخلاق کو غارت کر رہے ہیں، ان فضول قابلیتوں سے وٹرن کو
 شہرت حاصل کرنے دو، تمہارا ذاتی جوہر جو رومہ کے شایان شان ہے یہ اور صرف یہ ہے کہ دنیا کو
 فتح کرو اور نیکی کو اس کا حکمران بناؤ، تھین یا دھین جب سائینز نے رومہ کے دیوان عام میں،
 دربار سلطین منعقد کیا تھا، تو اوس نے وہاں آکر غیر ضروری نمائش و آرائش اور بناوٹی آداب
 تہذیب، نہیں دکھی تھی، اوس نے مقرروں کی فضول بکواس نہیں سنی تھی، جس کو اب بر خود غلط
 لغو خطیب، سرمایہ نار سمجھتے ہیں، اور ناموری کا آلہ تصور کر کے، اس پر اس قدر اپنی جان کھپاتے
 ہیں پس وہ کون سی عظمت تھی جو سائینز نے مشاہدہ کی تھی، میرے ہم وطنو! اس سے وہ شریفانہ
 منظر دیکھا تھا، جس کی نظر چشم فلک نے بھی نہ دیکھی ہوگی، اور یہ منظر تمہاری دولت اور تمام فنون
 یکجا ہو کر بھی نہیں دکھا سکتے، یعنی اس نے دوسو خوشحال انسانوں کا مجمع دیکھا جو رومہ پر فائز والی

کی اہمیت اور تمامی عالم پر حکومت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے،

اندھم کو اس قدر دور جانے کی کیا ضرورت ہو کہ گذشتہ زمانہ اور دور افتادہ ممالک کا مطالعہ کریں ہم اپنے ملک اور اپنے زمانہ ہی کا مشاہدہ کیوں نہ کر لیں اور غور کریں کہ آخر یہاں کیا ہو رہا ہے، میں ان تمام ناروا بیانات کو قلم انداز کرتا ہوں جن کو سنکر، تہذیب کی آنکھیں شرم سے نیچے جھک جاتی ہیں، اور یہ ذکر ہی نہیں بے سو و، اس لیے کہ یہ گویا ایک ہی بات کو دوسرے پیرایہ میں بیان کرنا ہوگا،

فابریسیس کے زبان سے جو خیالات ادا کرائے گئے ہیں وہ تاثر، لوی دوازوہم اور ہنری چہارم کے منہ سے بھی اسی مناسبت کے ساتھ نکل سکتے ہیں، یہ سچ ہے کہ آج سقراط کو فرانس میں شوکران کا پیالہ پینا نہ پڑتا، لیکن اُسے اس سے کہیں زیادہ تند و تلخ دارو جام نوش کرنا پڑتا، جس کو عرف عام میں تصغیک، توہین اور تحقیر کہتے ہیں اور جو موت سے سو جبہ بدتر ہے،

پس انسان کے غرور کی یہ ساری جدوجہد جو خوشگوار جہالت کے درمیان سے نکلنے میں کی جاتی ہے، جس کے اندر ہم کو اس غالم الغیب کی مشیت نے رکھا تھا، ساری خرابیوں کا پیش خیمہ ہے، بد راہی، عیش پرستی، سیاہ کاری، شہوت رانی، اور غلامی یہ سب اسی کا نتیجہ ہیں، وہ موٹی نقاب جو اس کی حکمت بالغہ نے، نو اسیں نطت کے چہرہ پر ڈال دی ہے، اس امر کی تین دلیل ہیں کہ ہم کو اس کے اندر رخنہ ڈالنے کے لیے نہیں پیدا کیا ہے، ہمارا منشا آفرینش، عمر عزیز کو، بیسود اکتشاف و تحقیق کی راہ میں راہیں گان کرنا ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا، کیا اس سے مفید تر کوئی دوسرا سبق ہو سکتا ہے اور اس کے یاد کرنے میں طفل کتب کی طرح ہم نے جان

نہیں چرائی ہے؟ انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے یہ بتدین اپنے دل پر نقش کر لینا چاہیے کہ جس طرح
 مان اپنے ناسمجھ بچے کے ہاتھ سے خطرناک ہتھیار چھین لیتی ہے، اسی طرح، قدرت، انسان کو
 علم کے ضرر سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے، ہم کو خوب اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ وہ تمام اسرار
 جن کو قدرت نے ہم سے پوشیدہ رکھا ہے، ہمارے حق میں مہلکات ہیں، جن سے وہ ہم کو بچانا
 چاہتی ہے، تحصیل علم میں انسان کو دشواریاں لاحق ہوتی ہیں، وہ کہنا چاہیے کہ ماہر قدرت
 کی عین نوازش ہے، انسان کی ابتدا اہل و نادانی سے ہوتی ہے، لیکن یقیناً اس کا حال بدتر ہوا
 خراب ہوتا اگر بدقسمتی سے وہ پیدا ہی عالم ہوتا!

انسانیت کے واسطے یہ خیالات کس قدر توہین آمیز معلوم ہوتے ہیں، اور ہمارے
 غرور کو اون سے کس قدر اذیت پہنچتی ہے، حیرت اپنے دل میں یہ سوال کرتی ہوگی کہ کیا واقعی
 جہالت، ایمان داری کی مان ہے؟ کیا علم و دانش مکارم اخلاق کی منافی ہیں؟ ان تقدیرات پر
 جو نتائج مستنبط کیے جائیں وہ بجا ہیں، لیکن ان ظاہری تناقضات کو رفع کرنے کے غرض سے
 ایک نظر ہم کو ان منفرد خطابات کے کھوکھلے پن اور سیوومی پر ڈال لینا چاہیے جو کس آب و
 تاب سے انسانی نفل کو عطا کیے جاتے ہیں اور جو ہمارے عقل کی آنکھوں میں خاک جھونک
 دیتے ہیں، ہم کو چاہیے کہ ہم علم و فن کی ماہیت پر غور کریں اور دیکھیں کہ اون کے عروج کا
 قدرتی انجام کیا ہوتا ہے اور پھر ان امور کے تسلیم کرنے میں ہم کو مطلق تامل نہ کرنا چاہیے،
 جن کی تائید میں ہمارے عقل کے ہم نوا تاریخی تجربات بھی ہیں،

حصہ دوم

مصر کی ایک قدیم روایت چلی آتی ہے جو یونان میں بھی متعارف ہے کہ علم کا موجد ایک دیوتا تھا، جس کی انسان سے ان بن تھی اور جو انسان کی آسائش کو دیکھ نہیں سکتا تھا، اس کہاوت سے پتہ چلتا ہے کہ اہل مصر جن کی آغوش میں علم نے پرورش پائی، علم کے متعلق کیا خیال رکھتے تھے، یہ ان لوگوں کا مقولہ ہے جنہوں نے اس سرچشمہ کا، کنارے پر کھڑے ہو کر قریب سے مشاہدہ کیا ہے، جہاں سے علم کی شاخیں پھوٹی ہیں حقیقت یہ ہے کہ خواہ ہم قصص پارینہ کی اوراق گردانی کریں، اور خواہ فلسفہ کی روشنی میں تاریخ کے تاریک واقعات سے نتائج اخذ کریں، اس امر کے تسلیم کرنے سے بہر حال مفرغ ہو گا کہ علوم و فنون کی نسبت جو حسن ظن ہمارے قلوب میں ہے، وہ اصلیت سے منزوں دور ہے، چنانچہ ملاحظہ ہو، ہیئت نے توہمات کی گود میں نشوونما پائی، فن خطابت، جاہ طلبی، کینہ پروری، دروغ بیانی اور خوشامد سے پید ہوا، علم ہندسہ نے حرص و ہوا کی فضا میں جنم لیا، طبیعیات ایک بے سوچہ جذب تفتیش کا ثمر ہے، حتیٰ کہ فلسفہ اخلاق کی پیدائش بھی نخوت کے بطن سے ہوئی، الغرض ہر علم و فن کا منبع تلاش کرنے سے انسانی اذائل کے اندر لٹتا ہے، بلاشبہ، انکا مبدراگر فضائل اخلاق ہوتے تو ان کو اس قدر مشتبہ نظر نہ دیکھا جاتا جیسا کہ اب لازماً دیکھنا چاہیے،

غور کرو تو ان کی اصلیت کا جث، خود ان کے مقاصد مذمومہ پر بخط چلی لکھا پاؤ گے،

ذرا سوچو کہ ان تمام علوم و فنون کا کیا حشر ہوگا۔ اگر نفس پرستی اور عیش پسندی اپنا دامن ان کے سر سے اٹھائے، اگر نوع انسان کے درمیان ظلم و ستم شایع ہی نہ ہوتا، تو پھر قانون و عدالت کی کیا حاجت تھی، تاریخ کو، کون پوچھتا اگر سرے سے دنیا میں جو رد ظلم، جنگ جہل کشت و خون، سازش و فریب کا وجود ہی نہ ہوتا، کس کے سر میں پھوڑے نکلے تھے کہ وہ عقلیات کی بجز زمین میں تخم پاشی کر کے اپنے اوقات ضائع کرتا، اگر انسان کو صرف احتیاجات نوعی کا احساس ہوتا اور ذرا فیض فطری خندہ پیشانی کے ساتھ ادا کرتا رہتا، اپنی زندگی کو وطن کی خدمت گزار ہی، اجباب کی دستگیری اور مصیبت کے ماروں کی امداد کے واسطے وقف رکھتا کیا ہم اسلئے پیدا ہوئے ہیں کہ جس کنوین میں حق مدفون ہو اوس کے کنارے پیدا ہوں اور وہیں جان دیدیں؟ میرے خیال میں صرف یہی ایک بات فلسفہ و حکمت کے بے سود مطالعہ کا سدباب کر سکتی ہے،

چو طرفہ، خطرات کا، نجوم ہی اور تحقیق کی گرد و پیش آئی غلط راہیں کھلی ہوئی ہیں کہ ہمارے قدم کا صحیح راہ پر پڑنے کے بجائے غلط راہ پر پڑ جانے کا زیادہ احتمال ہی، پھر وہ تمام غلطمان جن کے جال میں ہر قدم پھنسیں کر رہ جانے کا امکان ہی، قطعاً زیادہ مضرت رسان ہیں، بہت قابلہ اوس حق کی منفعت بخشی کے جس کے جستجو میں ہم نکلے ہیں، ہماری مشکلات محتاج بیان نہیں، اسلئے کہ اگر حق کی واحد مطلق شکل ہی، تو باطل بے شمار شکلوں میں ہمارے سامنے آکر ہیں دھوکا دے سکتا ہے۔

عالم تمام حلقے و اہم خیال ہی

ہستی کے مرتزب میں آجایو ہند

علاوہ برین مجھے بتائیے کہ وہ کونسا شخص ہے جو بالکل سچائی کے ساتھ محض حق کی تلاش میں گھوم کرین کھانے نکلا ہو، اور پھر تھوڑی دیر کے لیے ہم اس کی نیک نیتی کو تسلیم بھی کر لیں تو یہ سوال باقی رہتا ہے کہ آخر وہ کون سی علامت ہے جس کے ذریعہ سے وہ حق کو امتیاز کرے گا، لا تعدد ولا تخصی اختلافات خیالات کے درمیان، وہ کونسا معیار ہے جس کے رو سے ہم صحیح فیصلہ کر سکیں، اور پھر آخر میں جو امر سب سے زیادہ دشوار ہے وہ یہ ہے کہ بالفرض ہم اپنی خوش نیتی سے حق کو پا بھی جائیں تو کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ اس کا صحیح استعمال بھی کرے گا،

پس علوم کا وجود، جس قدر اپنے اغراض کے لحاظ سے عبث ثابت ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ اپنے نتائج کے اعتبار سے خطرناک ہے، چونکہ علم کاہلی کے بیج سے پیدا ہوتا ہے، اسلئے کاہلی و سہل انکاری کے برگ و بار لاتا ہے اور سوسائٹی کی زمین میں تضرع اوقات کا زہر پیلانچ ہوتا ہے، حیات انسانی کا کارآمد مشاغل سے تہی دست ہونا، مذہب سیاسیات کا بھی اسقدر سنگین گناہ ہے، جیسا کہ مذہب اخلاقیات کا اور ایک غیر مفید مستی کا وجود، سوسائٹی کے واسطے خطرہ عظیم ہے، اے مشاہیر فلسفہ و حکمت! مجھے بتاؤ کہ تم سے جو معلومات گونا گون ہم حاصل کرتے ہیں، ان سے ذرہ بھر مادی فائدہ بھی ہم کو پہنچ سکتا ہے، تم ہمیں بتاتے ہو کہ خلاء کے اندر کشش ثقل کی نسبت یہ اور یہ ہوتی ہے اور یہ وقت واحد مختلف سیاروں کے درمیان نسبت مسافت یہ ہوتی ہے، تم ہمیں تعلیم دیتے ہو کہ خطوط منحنی میں، نقاط متبادلہ، کس کو کہتے ہیں، تقاطع انحنائے کن کا

Conjugate points ۷۰ نقاط متبادلہ

Curve ۷۱ خط منحنی

۷۲ نقطہ انحنائے

Point of inflection

نام ہی اور نقاط متصلہ سے کیا مراد ہے، تم جو ہم سے کہتے ہو کہ جسم و روح کے درمیان وہی مطابقت ہی جو دو گھڑیوں کے درمیان ہوتی ہے، حالانکہ ایک دوسرے سے غیر مربوط اور جدا ہوتے ہیں تمہیں یہ بھی بتاتے ہو کہ فلان سیارہ قابل سکونت ہے اور فلان نہیں ہے اور یہ کہ بعض کیڑوں کا طریق تناسل معمول کے خلاف ہوتا ہے، براہ مہربانی، مجھے بتاؤ کہ اگر ہم تم سے یہ معلومات عالیہ حاصل نہ کرتے تو کیا ہم مردم شماری میں کم ہو جاتے، یا ہمارا نظام حکومت ناقص رہ جاتا، یا یہ کہ ہماری وقعت یا فلاح میں فرق آجاتا یا یہ کہ ہمارا بدی کی جانب میلان طبع زیادہ ہو جاتا، اپنے دل میں ذرا سوچو کہ تمہارے تصنیفات کی بھلا کیا قدر ہو سکتی ہے، جبکہ اعلیٰ دماغ، حید عالم اور زبدۃ الفضلاؤ کی دماغ سوزیوں کا یہ حال ہے، کہ منفعت عامہ اور سو و مندی سے بالکل عاری ہیں، پھر بتائیے کہ نمل نویسون کا وہ غول اور بیکار محض "ایسوں کا وہ گلہ، جو منفعت میں حکومت کا خون چوستا ہے، کس مصرف کا ہے؟

(دوزخ میں ڈال دو، کوئی لیکر بہشت کو)

میرے منہ سے "بیکار محض" کا لفظ نکل گیا، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنے کی جاتھی، اگر بس اتنا ہی ہوتا کہ ان حضرات کی ذات سے جماعت کو کسی طرح کا نفع نہ پہنچتا، اگر صرف اتنا ہوتا، تو بھی ہمارے اخلاق بدرجما اچھے ہوتے، اور ہماری زندگی کمال طمانیت سے گذرتی لیکن قیامت تو یہ ہے کہ مغرور اور باطل پرست، کلہ دراز اپنی زہریلی بدعتوں کو چوڑی پھیلاتے پھرتے ہیں اور ہمارے ایمان کی جڑ اور اعمال صالحہ کی بنیاد کو کھود کر پھینک رہے ہیں جس وطن

اور مذہب کے پاک ناموں کی ہنسی اڑاتے ہیں اور اپنی ساری علمیت ہمارے قدیم اور عزیز عقاید کی تخریب و توہین میں صرف کر رہے ہیں کہ وہ فی نفسہ نیکی اور عقیدہ سے بیرکھتے ہیں، بلکہ یہ کہ وہ تو می روش و رائے کے دشمن ہیں، اگر عالم کے کل محدود دنیا کی ایک نوآبادی قائم کر کے، ہر ملحد کو جلا وطن کر کے، اوس میں بسا دیا جائے، تو یقین ہے کہ بہت تھوڑے عرصہ میں وہ سب گرجا کی مٹاؤں کے آگے گھٹنے ٹیک دینگے، دیگانہ روزگار بننے کا خط بھی، انسان سے کیا کیا خرافات کراتا ہی،

تفصیح اوقات. بلاشک ایک نہایت مذموم عمل ہے، لیکن اس کے علاوہ، اور بہت سے ذمائم، علم و ادب کے جلو میں ہوتے ہیں، چنانچہ انہی میں سے ایک عشرت پسندی ہے جو دیگر فضائل قبیحہ کی طرح کاہلی اور غرور سے پیدا ہوتی ہے، ایسا تو شاذ و نادر ہوتا ہے کہ عیش پسندی کے ساتھ علم نہ پایا جائے، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ علم کے ساتھ عیش طلبی نہ پائی جائے، میں جانتا ہوں کہ جہاں فلسفہ کے اور بہت سارے خلاف عقل دعویٰ ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے، اگرچہ ہر عہد کے تاریخی تجربات نے اوس کو جھٹلایا ہے، کہ عیش کے گوہر سے تاج کی زینت ہے، قطع نظر قانون تغلیل مصفا کے نفاذ کی ضرورت و اہمیت کے، کون انکار کر سکتا ہے کہ اخلاق کی راستی پر حکومت کی بقا کا مدار ہے، اور راستی و درستی اخلاق عیش طلبی کی ضد اور عکس ہے،

ہم یہ تسلیم کیے لیتے ہیں کہ عیش جوئی دو تمدنی کا ایک ضمیمہ خاص ہے، ہم یہ بھی آپ کی خاطر سے، تھوڑی دیر کے لیے، فرض کیے لیتے ہیں کہ عیش و آرام، دولت و مال کی ترقی میں معین ہیں، لیکن اس قبیل کی مستعدات جو زمانہ کافیشن بن گئے ہیں، ان کے لیے سے مال کا کیا نکلے گا،

بہر حال اگر ہم تحصیل مال و منال کو اپنی زندگی کا مقصد و حید قرار دے لیں تو فرمائیے کہ پھر ہمارے
 محاسن اخلاق کا کیا حشر ہوگا، اور نیکی کی کیا کچھ گت بنیگی، قدیم ماہر سیاسیات، اور مدبر بات
 بات پر مکارم اخلاق، "حسنا" اور فضائل کے الفاظ استعمال کرتے تھے، لیکن عصر جدید کے
 ارباب حل و عقد تجارت اور دولت کے سو کسی چیز کو نہیں جانتے، کوئی کہتا ہے کہ فلان ملک میں
 انسان کی قیمت صرف اس قدر ہے، جس قدر جائیداد کی قیمت اجرا میں اٹھ سکتی ہے، دوسرا
 حساب لگا کر، تخمینہ کرتا ہے کہ فلان ملک میں آدمی کو بیچنا چاہو تو کچھ بھی ہاتھ نہ آئے اور فلان ملک میں
 اس کی قیمت سے بھی کم ہے، اُلٹا اپنی گرہ سے دینا پڑے، یہ لوگ انسان کی قدر اور قیمت کا اندازہ
 بیلیون کے گلدے کی طرح لگاتے ہیں، چنانچہ، اون کے نقطہ نظر سے انسان کی قیمت معاوضہ حکومت
 کے واسطے صرف اس مقدار پیداوار کے حساب سے ہو سکتی ہے جو وہ اپنے صرف میں لاتا ہے،
 چنانچہ ساہرینیکا ایک باشندہ ایسی، ڈیونیا کے کم از کم تین باشندوں کے برابر قیمت رکھتا ہے، ان
 محاسبین سے ذرا کوئی پوچھے کہ وہ کونسی جمہوری سلطنت تھی، ساہرینیریا اسپارٹا جس کو معدودے
 چند کسانوں نے فتح کیا تھا اور جو تمام ایشیا کے واسطے ہیبت بن گئی تھی، ساہرینیریا کی بادشاہت
 تیس ہزار جو انوں کے ایک مفلس شہزادہ کی سرکردگی میں، جو اپنی جگہ، ایک ایرانی صوبہ دار سے
 بھی کم حیثیت تھا، فتح کر لی اور ساہرینیریا نے جو افلاس میں سب تو مومن سے بڑھ کر تھی، دنیا
 کے بڑے بڑے بادشاہوں کا منہ پھیر پھیر دیا، جب فرمانروائی عالم کی امیداری میں دو جمہوری
 حکومتیں کھڑی ہوئیں جن میں سے ایک مال و دولت سے بہرہ مند اور دوسری تہی دست تھی،
 تو کامیابی آخر الذکر ہی کے ہاتھ رہی، اور رومہ کی سلطنت، ثروت و نعمت دنیا سے خوب شکم سیر کرنے

کے بعد بالآخر اس قوم کا شکار ہوئی جو دولت کے نام سے بھی آشنا تھی، فرانکوں نے گالوں کو زیر کر لیا، سیکسنوں نے انگلینڈ فتح کیا، جبکہ ان کے پاس شجاعت و افلاس کے سوا دوسرا خزانہ نہ تھا، غریب پہاڑیوں کا گروہ جن کی طمع کا سدرة المنتہی بھیر کی چند کھالوں سے زیادہ نہ تھا، آسٹریا کے غرور کو پسپا کر کے آگے بڑھے، اور گنڈی کے پر غلٹ و اجلال محل پر اپنا نشان فخر خمی نصب کیا، یہ وہ ایوان تھا جس کے روبرو آکر، یورپ کی بڑی بڑی قومیں تھر تھر کانپتی تھیں، چارلس چہم کے وارث کی ساری شہامت و دانائی، مٹھی بھر ہا ہی گیرون کا شکار ہو گئی، پس بدبرین وقت سے میری بصد ادب التجاہد کہ وہ براہ مہربانی ایک لمحہ کے لیے اپنی سیاسی مساحت و تخمین کو علیحدہ رکھ دین اور ان مثالوں پر غور کریں، ان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ اگرچہ روپیہ ہر چیز خرید سکتا ہے، لیکن اخلاق حمیدہ اور قابل شہری نہیں خرید سکتا، چنانچہ عشرت رانی کے متعلق نتیجہ طلب یہ امر ہے کہ سلطنتوں کے حق میں کونسی صورت بہبودی کی ہو، آیا یہ کہ ان کا وجود پر رونق و آراستہ مگر عارضی و ہنگامی ہو یا یہ کہ صفات حسنہ سے مزین اور دیر پا ہو، پُر رونق و آراستہ لیکن کس زیور سے، ذوق آرائش اور حاسنہ ایمان کبھی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے، یہ قطعی ناممکن ہے کہ وہ دماغ جو پوٹنج اور پُرخیاالات کا فانوس بنا ہوا ہو، یہ حقیقی عظمت و شرافت کا تجلی گاہ بن سکے، اگر اس میں صلا بھی ہو تو ہمت نہیں ہو سکتی،

اہل فن و ادب و تحسین کے پیاسے ہوتے ہیں اور ہم عصرون کی ستائش، اپنی محنت کا سب سے بڑا معاوضہ سمجھتے ہیں، فرض کرو کہ ایک ماہر فن اپنی سیاہ بختی سے ایسے زمانہ میں

پیدا ہوتا ہے، جہاں اگرچہ علم و ادب کا چار سو ڈنکان بج رہا ہے، لیکن نوخیز دن کی سطح النظری اور خیرہ مذاقی ہر شعبہ ادب پر چھائی ہوئی ہے، مذاق سلیم کی آزادی زمانہ کے دستبرد سے سلب ہو گئی ہے، اور رجحیت پر نسائیت کا غلبہ ہے، شاعری کے بلند تخیلات اور موسیقی کی اعلیٰ امان کو کوئی نہیں پوچھتا، ایسی حالت میں، فرمائیے کہ وہ یکتائے عصر، قدرتہ کیا کریہ گا، اس کو لامحالہ، اپنی رفعت خیال پست سطح پر طوعاً و کرہاً اتارنا ہوگی، اور ایسے کم پایہ تصنیفات پر فدا مت کرنا ہوگی، جن کی قدر زمانہ کر سکے،

جبکہ ان تمام اعلیٰ خیالات و جذبات کی ترجمانی سے جن کی قدر مرنے کے بہت عرصہ بعد ہو سکتی ہے، دست بردار ہونا پڑیگا، مشہور عالم شاعر و الیٹری سے کوئی پوچھے کہ اُسے کتنے ولفٹین و دگڈاز اعلیٰ ذہن دست مضامین پست اور ادنیٰ نازک خیالی کی خاطر ذبح کرنا پڑے اور کتنے تخیلات، جن کا مایہ خمیر عظمت و شرافت تھا، اس مذاق مبتذل کی نذر ہو گئے، جو بازاری اور چھوڑی و ادب پر مشابہ تھا،

الغرض تخریب اخلاق جو عشرت پسندی کا لازمی نتیجہ ہے، ذوق سلیم کو بھی بگاڑ دیتا ہے اور بالفرض ان ذلیل اور ادنیٰ قابلیتوں کے درمیان، کوئی ایسا عالی ہمت دماغ ہوا بھی جو زمانہ کی روشن نہ چلا اور جس نے اپنے نام کو دن مرتبہ تصنیفات کے داغ سے بچایا، تو ظاہر ہے کہ اس کو کیا کیا کچھ کڑھی جھیلنا ہوگی، اور انجام افلاس اور گنہگامی کی موت کے سوا اور کچھ نہ ہوگا یہ کوئی پیشین گوئی نہیں ہے بلکہ واقعات ہیں، جن کو تاریخ بار بار دہرا چکی ہے، اور تجربہ ثابت کر چکا ہے، ان اے کا زلے اور پیری و انلو اب وہ وقت آگیا، جب کہ تمہارے ہاتھ سے نسلین چھوٹ کر جائیں، اس لئے کلاب

تم ان سے وہ مقدس موقع نہیں کھینچ سکتے جو عبادتگاہوں کی شان بزرگی کے شایان تھے، ہاں اب تمہارے سامنے دو ہی صورتیں ہیں یا تو ظلم اپنے ہاتھ سے ہمیشہ کے لیے پھینک دو یا اپنے تئیں ایک زنِ بازاری کی طرح زر و مال کی ہر بڑی بولی کے معاوضہ میں تچ دو اور ریسون کی گاڑیوں کے گڈون پر فحش تصویریں بنا کر اپنا وقت کاٹا کرو!

اے عدیم المثال بگل، فڈیس، اور پرسی ٹیلر کے حریف مقابل، تو کہ جس کی رخانی عمدہ قدم کے دیوتاؤں کے بت تراشنے میں استعمال ہوتی تھی، ہاں تیرے سامنے بھی یہی سوال ہے کہ یا تو اپنے ہاتھوں کو برہنہ بند روں کا مجسمہ بنانے سے ذلیل کرادیا پھر ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہو!

ایام قدیم کی سادگی اور حسن سیرت کا جب ہم تصور کرتے ہیں تو ہمارا دل سرت بے اندازہ سے لہریز ہو جاتا ہے، اس تخیل کو تشبیہ کے پیرایہ میں ہم یون بیان کر سکتے ہیں کہ گویا ایک شاداب و دلکش ساحل جو جس کو قدرت نے اپنے ہاتھ سے سنوارا ہے اور جس پر ہماری ٹکٹکی لگی ہے، جبکہ ہماری کشتی حسرت و افسوس کے ساتھ رفتہ رفتہ اس سے دور ہوتی جاتی ہے، انسان جب عصمت و ریشی کا تپلا تھا اور اس امر کا خواہاں تھا کہ دیوتا اس کے اعمالِ حسنہ کا برائے العین شاہدہ کریں تو وہ دیوتاؤں کو اپنے ساتھ اپنی جھوٹی میمن رکھتا تھا، لیکن جب اوس نے بد اعمالی پر مکر باندھی تو اغیار کی نظروں سے بچنے کی فکر ہوئی اور اس نے دیوتاؤں کو عالیشان مندروں میں بھگا دیا، بالآخر ان کو یہاں سے بھی نکال باہر کیا اور وہاں خود سکونت پذیر ہو گیا، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہو، کہ اس نے اپنے ایوانِ محل، مندروں اور خانقاہوں سے بھی زیادہ پر شوکت بنائے، یہ بد اعمالی کی انتہا تھی اور بدی کے واسطے ترقی کا شاید اس سے زیادہ بلند درجہ باقی نہ تھا، جبکہ وہ روسا کے درو دیوار پر منقوش ہوئی،

اور عالیشان ستونوں کی پیشانی پر کورتھی وضع کے میل بوٹوں کے پیرایہ میں کھودی گئی،
 چون جون حیات انسانی کے اندر سہولتون کا اضافہ ہوتا جاتا ہے، فنون کی اشاعت اور
 سامان عیش و عشرت کی ترقی ہوتی جاتی ہے، مگر شجاعت کا جو ہر مع دیگر فضائل کے انحطاط پذیر ہوجاتا ہے،
 اور یہ لازمی نتیجہ ہے علوم و فنون کے شیوع کا بالخصوص اون فنون کا جو خانہ نشینی چاہتے ہیں، گو تمہ
 قوم نے جب یونان کو تاراج کیا تو کتب خانے نہیں جلائے، بھلائے چھوڑ دیئے تاکہ اون کے دشمنوں کے درمیان
 اس شے کا وجود قائم رہے جس نے اون کو فن سپاہگری سے غافل رکھا تھا اور کتب خانہ پرست بنا دیا تھا
 چارلس ہشتم نیام سے تلوزسکاے بنیرلسکنی اور نیلینز کا مالک بن گیا تھا اور اس غیر متوقع
 کامیابی کا راز، اس کے اہل دربار کے نزدیک یہ تھا کہ اطالیہ کے شہزادے اور شریف زادے فوجی
 و علمی مشاغل کے بجائے فلسفہ اور منطق کے مطالعہ پر مفتون تھے، ایک معاملہ فہم مورخ جس نے ان لوگوں
 کے جملہ خصوصیات قلم بند کئے ہیں، لکھتا ہے کہ ”تجزیاتی طور پر بتلا ہے کہ علم و فن کی جانب رغبت اور
 اس کی تحصیل، انسان کو بزدل بلکہ نامرد بنا دیتی ہے اور فوجی یا اسی قبیل کے دیگر مشاغل کے واسطے،
 ان کو بالکل ازکار رفتہ بنا دیتی ہے“

اہل رومہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ ایک طرف انھوں نے فنون لطیفہ میں ترقی کی اور مصوری
 و سنگ تراشی میں کمال حاصل کیا اور دوسری طرف اپنے فوجی فضائل کی دولت کو ہاتھ سے کھویا،
 معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قدرت کو منظور ہی یہ ہے کہ یہ ملک تمام دنیا کے واسطے تازیانہ تہنیہ بنے، اسلئے کہ
 مسپڈائیون نے پھر زور باندھا ہے اور علم و ادب اور شعور و سخن کی پھر شرذعات ہوئی ہے، اس سے اطالیہ
 کی رہی سہی فوجی شہرت کا چند آئندہ صدیوں کے واسطے خاتمہ سمجھ لینا چاہیے،

یونان کی قدیم جمہوری سلطنت نے جس کی دانشمندی اور دیرینی اس کے اکثر رسومات سے ظاہر ہوتی ہے، ان تمام مشاغل کو ممنوع قرار دیا تھا جو انسان کو بیٹھے بیٹھے انجام دینا ہوتے ہیں، اسلئے کہ ان کے اثر سے جسمانی توانائی برباد اور دماغی حسی کا کھوج مارا جاتا ہے، غور کرو کہ وہ شخص جو نہایت معمولی حاجت کے لائق ہونے اور ذرا سی شکل پیش آجانے سے سرسیم ہو جاتا ہے، وہ بھلا، بھوک، پیاس، تکان، خطرات اور موت کا کمان تک مقابلہ کر سکتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ سپاہی جو شفت سے بالکل نا آشنا ہے، جنگ کے صعوبات اٹھانے میں کیا پامردی دکھا سکتا ہے اور وہ فوج جس کے افسر گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوئے ہوئے تھک جاتے ہیں، کیا خاک، دور و دراز منزل قطع کرنے میں جوش و استعداد دکھا سکتی ہے، آج کل کے سپاہی جن کی فوجی تعلیم نہایت باقاعدہ، فن سپاہگری کے اصول پر ہوتی ہے، صرف دن بھر کے موکہ جنگ میں کچھ داد و شجاعت دیکھیں تو دے سکیں، سو اس سے میرے دعویٰ کی تردید نہیں ہوتی، ان کو کسی دیر طلب، کٹھن مورچہ پر بے رسد، بے آب و دانہ، سخت موسم میں مدت تک پڑا رہنے دو تو ساری قلعی کھل جائے، تھوڑی دیر کی دھوپ یا رنباری، بلکہ چند غیر ضروری حوائج کے پورا ہونے میں تاخیر، چند وز کے اندر چیدہ سے چیدہ فوج کے چھکے چھڑا دیتی ہے، اسے بہادر سپاہیو! مجھے معاف کرنا اگر میں تمہارے متعلق ایک امر حق کا اظہار کر رہا ہوں مجھے تمہاری شجاعت میں کلام نہیں ہے، مجھے اس میں ذرہ بھر شک نہیں ہے کہ اگر تم نہی بال کے ساتھ ہوتے تو کئی اور ٹرپسی میں کو فتح کر لیتے، نیز یہ کہ تم قیصر کے ساتھ رومی کان سے ضرور گذر جاتے اور اس کو ملک گیری میں پوری امداد پہنچاتے یہ سب میں ماتا ہوں، لیکن قیصر معاف، آپ نہی بال کے ہمراہ کوہ الپس کو عبور نہیں کر سکتے تھے،

اور قیصر کے ساتھ اپنے اسلاف، گال کو مغلوب نہیں کر سکتے تھے،

کسی جنگ کی کامیابی کا مدار محض کشت و خون اور مرکزِ جدال و قتال کے واقعات ہی پر نہیں ہے، بلکہ سپہ سالاری بھی کوئی چیز ہے اور یہ دراصل سب سے مقدم ہے، ممکن ہے کہ ایک بہادر گولیوں کی بارش میں میدان میں قدم جمائے کھڑا رہے، لیکن فوج کی قیادت کا اہل نہ ہو، معمولی سپاہی کے اندر بھی جسمانی طاقت اور جوش، نرمی شجاعت کے مقابلہ میں زیادہ کارآمد جوہر ہیں، اس لیے کہ خالی شجاعت موت سے نہیں بچا سکتی۔ سپاہی خواہ سردی اور بخار کا لقمہ بنے اور خواہ تلوار کے گھاٹ اترے، سلطنت کا زیان، دونوں حال میں یکساں ہی ہے،

الغرض علوم و فنون کی ترقی اگر ایک طرف فوجی اوصاف کی جوڑ کاٹ رہی ہے، تو دوسری طرف محاسن اخلاق کے حق میں کانٹے بوری ہیں، جدمہر دیکھو بڑے بڑے دارالعلوم نظر آتے ہیں، جہان طلباء کو سرہن میں طاق بنایا جاتا ہے، مگر نہیں بتایا جاتا تو یہ کہ اون کے فرائض کیا ہیں، وہ اپنی مادری زبان سے تو کورے رہتے ہیں، مگر مردہ زبانیں جو دنیا کے پردہ پر کہیں نہیں بولی جاتیں، فرزبول سکتے ہیں، وہ ایسے شعر بھی کہہ سکتے ہیں جن کا مطلب خود بھی نہیں سمجھ اور سمجھا سکتے اور اگرچہ وہ خود حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے، لیکن ان کو ایک ایسا فن آتا ہے جس کی مدد سے وہ ایسے مغالطاتی تصنیف کر سکتے ہیں کہ دوسرا بھی چونہ دھیلا جائے اور صحیح و غلط میں امتیاز نہ کر سکے، ان تمام اوصاف کے زیور سے تو وہ سرتاپا آراستہ ہیں، لیکن، الوالعزمی، عدل، عفت، انسانیت، اور شجاعت، ایسے الفاظ ہیں جو کبھی اون کے دل میں شرمندہ معنی نہیں ہوئے، ملک کے پیارے نام سے اون کے کان نا آشنا ہیں، اور اون کے منہ سے خدا کا پاک نام اس لئے نہیں نکلتا ہے کہ اون کو اس کا دھیان ہے،

بلکہ اس لئے کہ اون کو اس کا ڈر لگا ہو، ایک عاقل کا قول ہے کہ ایسی درسگاہوں میں بھیجنے کے بجائے
 میں بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنے بچے کو ٹینس کورٹ میں بھیج دوں، اس لئے کہ وہ ان کھیل کو دوست
 اوس کو کچھ جسمانی فائدہ تو پہنچے گا، میں اس نکتہ سے بے خبر نہیں ہوں کہ بچوں کو ہمیشہ کسی نہ کسی
 مشغلہ میں پھنسائے رکھنا چاہیے، اسلئے کہ بیکاری اون کے حق میں زہر ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ
 ان کو کیا تعلیم دی جائے؟ اون کو تعلیم ایسی دینا چاہیے جو آئندہ کام آئے، نہ ایسی کہ جس کا بھول
 جانا ہی اچھا ہو،

سنئے، اسپارٹا میں تعلیم کا طریقہ کیا تھا، مورخ تھیسٹین نے نہایت بسط و شرح کے ساتھ وہاں کے
 سب سے بڑے بادشاہ کی تعلیم کا حال لکھا ہے، اسپارٹا کی کل درسگاہوں میں ادب کی تعلیم سے
 زیادہ اخلاق پر زور دیا جاتا تھا، حتیٰ کہ علم و ادب کے مرکزی مقام پر بھی، علماء و فضلا کے بجائے،
 شجاعت، پرہیزگاری اور عدل کے جو اہر سکھانے والوں کی مانگ تھی،

ایران قدیم کے وسیعہ کی تعلیم پر ایک نظر ڈالو، افلاطون کا بیان ہے کہ ولادت کے بعد شہزادہ
 عورتوں کے حوالہ نہیں کیا گیا، بلکہ اون خواجہ سراؤں کے سپرو کیا گیا، جو اپنے محاسن اخلاق اور
 مکارم اوصاف کے اعتبار سے بڑا مرتبہ رکھتے تھے، اور مقرب بارگاہ سلطانی تھے، ان کا کام شہزادہ کی
 جسمانی صحت و صورت کی دیکھ بھال تھا، سات سال کا بس ہونے پر انھوں نے شہزادہ کو شہسوار کی
 فن سکھایا اور سیر و شکار کا چسکا ڈالا، چودھویں سال دو چار آدمیوں کی تربیت میں دیا گیا جن میں سے
 ایک سلطنت بھر میں سب سے زیادہ دانشمند، دوسرا سب سے زیادہ عادل، تیسرا سب سے
 زیادہ پرہیزگار، اور چوتھا سب سے زیادہ شجاع تھا، پہلے شخص نے مذہبی تعلیم دی، دوسرے نے

حق اور انصاف پر جمایا، تیسرے نے نفسانی خواہشات کو دبانے کے کرتبائے اور چوتھے نے ہر ممکن
 خطرہ سے اوس کا ڈنکال دیا، اور اس طرح سب نے مل جل کر، شہزادہ کو خدا کا ایک نیک بندہ
 بنا دیا یہ کہ ان میں سے کوئی اس کو عالم فاضل بنانے کی سعی لا حاصل کرتا،
 زنون کے مکالمات میں ہو کہ ایسا بیجز، سائرس سے کہتا ہو کہ بھئی اپنے بکتی زندگی کا
 سب سے آخری واقعہ تو بیان کرو، سائرس بیان کرتا ہو کہ مدرسہ میں دو لڑکے تھے ایک بڑا اٹھا،
 اور ایک چھوٹا تھا، بڑے لڑکے کا کوٹ، چھوٹا تھا اور چھوٹے کا بڑا تھا، چنانچہ بڑے لڑکے نے چھوٹے
 لڑکے کا کوٹ چھین لیا اور اپنا چھوٹا کوٹ اس کے سر مارا، شکایت ماسٹر تک پہنچی اور انھوں نے
 مجھے ثالث مقرر کیا، چنانچہ تفتیش و سماعت کے بعد میں نے اپنا فیصلہ یہ دیا کہ چونکہ دو لون لڑکوں کی
 نئی پوشاک دو لون کو سجتی ہو اور اون کے ٹھیک ہو، لہذا معاملہ کو اسی طرح رہنے دیا جائے، ماسٹر نے
 جب میرا یہ فیصلہ سنا تو بہت خفا ہوئے اور کہا کہ تم نے محض ظاہری دستی اور تن آسانی پر فیصلہ دیا،
 حالانکہ آرام و درستی پر عدل مقدم ہو، عدل کی اساسی منشا یہ ہو کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی چیز پر
 زبردستی قابض نہ ہو،

ہمارے باغات بتوں سے سجے ہوئے ہیں اور ہمارے عجائب خانہ تصویر دن سے آراستہ
 ہیں اور یہ گویا فنون لطیفہ کے کارناموں کی نمائش، پبلک قدر دانی کے لئے کی گئی ہو، لیکن تم اس کا
 کیا نتیجہ نکالتے ہو، آیا یہ مجسمہ اون اکابر رجال کی یادگار ہیں جنھوں نے ملک کی حفاظت میں اپنی
 جان دیدی، یا ان سے بڑھکر ان لوگوں کی یادگار ہیں جنھوں نے اپنے فضائل اخلاق کی دولت سے
 ملک کو مالا مال کر دیا؟ نہیں ہرگز نہیں بلکہ یہ ان رکیک اور بتدل جذبات کے مجسمات ہیں، جن کو

اساطیر قدیمہ سے لیکر، بچوں کے سامنے سب سے پہلے پیش کر دیا جانا ہوتا ہے تاکہ نوشت و خواندگی کی تحصیل سے قبل بد اعمالی کا زہر اثر کر جائے،

لیکن یہ تمام خوبیاں کہان سے پیدا ہوئیں، ظاہر ہے کہ یہ تمام نتیجہ ہے اس عدم مساوات کا جو عالم انسانیت کے اندر، علیست و دستگاہ کے اختلاف مراتب اور فضائل اخلاق کی بے قدری کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں، ہمارے تحصیل علوم کا یہ سب سے زیادہ درختان اور سب سے زیادہ خطرناک اثر ہے، انسان سے متعلق آج یہ سوال نہیں ہوتا کہ آیا وہ ایماندار ہے یا نہیں، بلکہ سوال یہ ہوتا ہے کہ آیا وہ چالاک ہے کہ نہیں، اس امر کا مطلق لحاظ نہیں کیا جاتا کہ آیا فلان کتاب مفید ہے یا غیر مفید، بلکہ تلاش یہ ہوتی ہے کہ اس کی عبارت چٹ پٹی ہے یا نہیں، جو دت اور جدت پر انعام و اکرام کی بوجھا ہوتی ہے، مگر "نیکی" کا کوئی پُرسان حال نہیں، انشا پر د از می کے کارناموں کے لئے ہزار ہا انعامات ہیں، لیکن نیک کاموں کے لئے ایک بھی نہیں، کوئی مجھے بتائے کہ اس اکاڈمی (دارالعلم) کا بہترین انعامی مضمون جو سب سے بڑا انعام حاصل کرتا ہے، کیا وقعت میں اس کا خیر کے مساوی ہو سکتا ہے؟ جس نے انعامی مضمون کی بنیاد ڈالی؟

وانا، کبھی عزت و اقبال اور مال و منال کا تعاقب نہیں کرتا، لیکن اس کے معنی نہیں کہ اسکے دل میں ناموری کی چاہت ہی نہیں ہے۔ جبکہ وہ حشمت و ریاست کی دنیاوی تقسیم میں اس قدر اندھیر دیکھتا ہے تو اس کے قلب میں مسابقت کا ولولہ ہی نہیں اٹھتا اور اس کی نیک کرداری جو سوسائٹی کے حق میں آئیہ کرم ثابت ہوتی، مر جھا جاتی ہے اور گنہامی و افلاس کے غار میں گر کر، نامید ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم فنون لطیفہ کا پلہ فنون مفیدہ پر بھاری دیکھتے ہیں، علوم و فنون کے نشاۃ جدیدہ نے

اس حقیقت کو افسوسناک طریقہ پر ثابت کر دیا ہے، ہمارے درمیان، ماہرین طبیعیات، اہل ہندسہ، علمائے کیمیا، نجومی، شاعر، مبصرین موسیقی اور مصور تو کثرت سے پائے جاتے ہیں، لیکن ایک تنفس نہیں، جس کو صحیح معنی میں فرزند ملک و قوم کہا جاسکے اور اگر دیہات میں خال خال ہوئے بھی تو اوان کے مقدر میں گننامی و کس پیرسی کی موت ہے، یہی ہمارا حال اور یہی ہماری غفلت، انسان کے اس مفید ترین طبقہ کی جانب سے جو ہم کو رزق مہیا اور ہمارے بچوں کو دودھ سے سیراب کرتا ہے، یہ ضرور ہے کہ ابھی نقتہ ذرا اس درجہ تک نہیں پہنچا ہے، جس درجہ تک اسے پہنچ جانا چاہیے جس طرح کارسازِ مطلق کی حکمت نے زہریلے پودوں کے پہلو میں زہرا پودے پیدا کیے ہیں اور زہریلے جانوروں کے جسم کے اندر اون کا تریاق پیدا کیا ہے، اسی طرح اس زمین کے فرمانرواؤں کے آئینے قلب پر بھی، اوس کی حکمت بالغہ کا پرتو موجود ہوتا ہے اور اس لحاظ سے ان کو نکل سکھنا کیا چاہیے؟ اپنے خالق حکیم کے قدم بقدم، یہ سلاطینِ عظام، جن کے آفتابِ شہرت کے انوار، روز افزون ہوتے ہیں، شر کے سینہ سے، خیر کو حیر کر نکال لیتے ہیں اور بحیرہ علم میں ڈوبی ہوئی، نیکی کی کشتی کنارے لگاتے ہیں، ان کے عہدِ معدلت ہمدین، دنیا کی مشہور انجمنیں نشوونما پاتی ہیں، جو اگرچہ ایک طرف علم و فضل کی خطرناک امانت کی کفیل ہوتی ہیں، لیکن دوسری طرف، فضائل اخلاق کی مقدس سرپرست ثابت ہوتی ہیں، یہ انجمنیں اخلاق کو ظاہر و پاکیزہ رکھنا، اپنا اور اپنے ہر ممبر کا فرض عین تصور کرتی ہیں، یہ مفید انجمنیں اگر وراثانِ تخت و تاج کی سرپرستی سے بہرہ اندوز رہیں اور دیگر شاہانِ یورپ نے بھی تقلید کی، تو علم و فضل جو اس میں داخلہ کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں، ذرا اپنی حرکات ناشایستہ سے چوکس رہینگے اور مشاغل مفیدہ و اعمالِ حسنیہ کے اختیار کرنے سے اپنے معین، عزت

مذہب کا اہل ثابت کرنے کی سعی بیخ کنیگی،

ان انجمنوں کی طرف سے علمی مضامین کے واسطے انعامات مقرر کیے جاتے ہیں اور ایسے عنوانات تجویز کیے جاتے ہیں جن پر غور کرنے سے دل آپ سے آپ نیکی پر مائل ہو، یہ اون کی نیک نہادی کا کھلا ہوا ثبوت ہے، اس نوعیت کی علمی انجمنوں کو دیکھ کر جو ایک طرف ایک خوشگوار ذہنی مشغلہ کا سامان مہیا کرتی ہیں اور دوسری طرف مفید تعلیم کی روشنی پھیلاتی ہیں حقیقی مسرت ہوتی ہے،

اگر ان خیالات پر کوئی اعتراض وارد کیا جائے، تو وہ اعتراض میرے دعویٰ کا مزید

ثبوت ہوگا، قاعدہ ہے، جب انتہائی اہتمام کیا جاتا ہے تو اس کا باعث بھی ضرور ہوتا ہے، اگر مرض

نہو تو دوا و دوش کیا ضرور ہے، علوم کی مسلمہ بے اثری کے باوجود، دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ ہمارے

امراض کی دوا ہیں، چنانچہ علم و فضل کی تحصیل و تکمیل کے واسطے صحت کا وسعہ ہونا چاہیے جو کھلی ہوئی ہیں،

وہ حقیقت حال پر پر وہ ڈاکٹر، تحصیل علم کی ترغیب دیتی ہیں اور اس جوش استعلام و استکشاف کو

دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ فلسفیوں کا ملک میں قحط پڑ گیا ہے اور کسانوں کی کثرت سے ملک پٹ گیا ہے،

میں یہاں کشادری اور فلسفہ کا موازنہ نہ کروں گا، اسلئے کہ فلسفہ اس کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا،

میں بس یہ سوال کرتا ہوں کہ فلسفہ آخر ہے کیا، شاہیر فلاسفہ کی تصنیفات کا حاصل کیا ہے اور عقل

و دانش کے ان دو ستون کے کیا نصاب ہیں، اگر ہم ان کی باتیں سنیں تو ہم کو ایسا معلوم ہوگا جیسے

کوئی ٹھگ بڈیاہ و افروش بازار میں کھڑا ہانک رہا ہے کہ ایسا الناس! ادھر آؤ! ادھر آؤ! میں

ایک طبیب حاذق ہوں..... وغیرہ وغیرہ، ان فلسفیوں میں سے کوئی تو کہتا ہے کہ سرے سے

مادہ کا وجود ہی نہیں، دوسرا کہتا ہے کہ نہیں بلکہ مادہ کے علاوہ کسی شے کا وجود نہیں اور یہی خدا ہے

تیسرا کتا ہے کہ خیر و شر، اسم بے مسمیٰ اور تصور بے مصداق ہیں اور حسنت و سیئات کی تفریق و اہمہ کا نقش زیادہ ہے جس کا خارج میں کوئی وجود نہیں، چوتھا کتا ہے کہ انسان ایک زندہ ہے اور نہایت ایمانداری کے ساتھ ایک دوسرے کو پھاڑ کھا سکتا ہے، اسے میرے عظیم انسان فلسفیو تم بس، میں تو بخشنو، تم ان نصیحتوں کو اپنی اولاد اور دوستوں کے لیے اٹھا رکھو، تم انشاء اللہ اس کا مزہ بہت جلد چکھ لو گے، اور پھر ہم کو بھی تمھارے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرنے میں کسی طرح کا وسوسہ نہ رہے گا،

یہ وہ عجیب و غریب آدمی ہیں ہم عصروں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور موت کے

بعد حیات جاوید کے دعویٰ دار ہیں، ان کے عاقلانہ اقوال، جن سے نسل بعد نسل استفادہ ہوتا رہے گا، بُت پرستی باوجود اپنی تمام ہرزہ سرائیوں کے ان شرمناک یادگاروں کے سامنے گردہ ہر جو پر بس عین عہدنا جیل میں قائم کر دی ہیں،

لیوپولڈ اور ڈاکوئرس کے ناپاک نوشتہ جات اون کے ساتھ دفن ہو گئے تھے، اوسن مانہ

میں دنیا اس فن سے بیگانہ تھی، جس کے ذریعہ سے انسانی و مانع کی غلط کاریاں اور بے عمد ایان حیات سرمدی پاسکتی ہیں لیکن فن طباعت کا ہزار ہزار شکر یہ کہ ہائیں اور اسپینوزا کے خیالات کا زہر ابراہا با تک پھیلنا نہ ہو گیا،

پریس کے خطرناک نتیجوں کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ یورپ کے سلاطین نے جس قدر قرون

ماضیہ میں اس کو ترقی دی تھی، اوس سے کہیں زیادہ، آئندہ چلکر، اس کے مٹانے میں کوشاں ہو گئے

سلطان احمد نے چند شایعین علم و صحاب ذوق کے کہنے سننے سے قسطنطنیہ میں ایک مطبع قائم کیا تھا، لیکن کم شروع ہوئے تو ٹوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ سلطان کو حکم دینا پڑا کہ سارا سامان کنوین میں لو ایا جائے

خلیفہ عمر کے متعلق روایت ہے کہ جب اون سے دریافت کیا گیا کہ اسکندریہ کے کتب خانہ کے بارے میں کیا حکم ہے تو اونھوں نے جواب دیا کہ "اگر کتب خانہ میں ایسی کتابیں ہیں جو قرآن مجید کے خلاف ہیں تو وہ شکر کا گھر ہے اور اس کو جلا دینا ہی بہتر ہے" اور اگر اس میں ایسی کتابیں ہیں جو ہم کو وہی باتیں بتاتی ہیں جو قرآن پاک میں موجود ہیں تو پھر اس کا عدم موجود برابر ہے" علماء کمال اس دلیل کا مضحکہ اڑاتے ہیں، لیکن اگر خلیفہ کے بجائے گریسے عظیم ہوتا اور قرآن کی جگہ اخیل ہوتی، تو کتب خانہ اس وقت بھی نذر آتش ہوتا اور یہ اس کی حیات کا بہترین عمل ہوتا،

اے مشہور کتابو! تم جو ہمارے اسلان کے نعم و استعداد سے باہر تھیں، جاؤ ہماری اولاد کے پاس جاؤ مع ان تمام کلیات اور دوا دین کے جاؤ جو تمدن جدید کے اطوار و ذیلہ سے متعفن ہیں، جاؤ تم سب ہم آواز ہو کر علم و فن کی ترقی کا گیت گاؤ، اگر ہمارے اخلاق سمجھدار ہوں گے تو یقین ہے کہ اون کو ہمارے دعویٰ کی نسبت ذرہ برابر شک نہ ہوگا اور اگر اس وقت نبی نوع انسان کو داعی سطح ہم سے بھی زیادہ پست نہ ہوتی تو وہ بقیرا ہو کر آسمان کی جانب ہاتھ اٹھا کر دعا مانگیں گے کہ "اے قادر مطلق تو جو انسان کے مانع کا خالق و مختار ہے، ہمارے آبا و اجداد کے علوم و فنون سے ہم کو نجات بخش اور ہماری ناوانی پارسانی اور محتاجی کو واپس دیدے اسلئے کہ یہی وہ چیزیں ہیں جو ہم کو طمانیت قلب بخش سکتی ہیں اور تیری نظریں ہم کو محبوب بنا سکتی ہیں،

الغرض علوم و فنون کی ترقی نے اگر ہماری حقیقی مسرت میں کچھ اضافہ نہیں کیا ہے، بلکہ ہمارے اخلاق کو خراب کر دیا ہے اور ہمارے مذاق سلیم کو بگاڑ دیا ہے، تو سوال ہے کہ ہم علماء کے اس گلہ کو کن لفظوں سے یاد کر لیں جنھوں نے ایک ایک کر کے اون تمام رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے،

جو علم کے شجر منورہ کی راہ میں تضاد و قدرت نے اس مصلحت سے حائل کی تھیں کہ ہر کس و تا کس کے قدم کو اس طرت بڑھنے کی مجال نہ ہو اور تنہا وہ جن کو علم کی طلب صادق ہو اپنی قوت کی آزمائش کریں، ہم اون ٹولفین کو کیا کہیں جنہوں نے علم کے مندر کا قفل توڑ ڈالا اور عوام الناس کو اسکے اندر جانے کی صلائے عام دی، چاہیے یہ تھا کہ جو علم و ادب کی راہ میں آگے نہیں بڑھ سکتے، اون کی پہلی ہی منزل پر ہمت شکنی کی جاتی تاکہ وہ کسی ایسے کام میں لگ جاتے جو جماعت کے حق میں مفید ہو۔ جس شخص کو تمام عمر شعر کہنا نہیں آسکتا جو ریاضی کا ماہر کبھی نہیں ہو سکتا، بہت ممکن ہے کہ اعلیٰ درجہ کا درزی ثابت ہو، جن لوگوں کو فطرت نے اپنی شاگردی کے لئے چن لیا ہے، وہ ہمیشہ استاد کی تعلیم سے بے نیاز رہے ہیں، چنانچہ بکین۔ ڈیکارٹ اور نیوٹن جنہوں نے کہنا چاہیے دنیا کو درس دیا ہے، کسی مدرس کے شرمندہ تدریس نہ تھے، کونسا رہنما اون کو کوہ علم کی اون دشوار گزار چوٹیوں تک لیجا سکتا تھا؟ جہاں کہ فطری استعداد نے اونہیں پہنچا دیا، معمولی استاد کے حلقہ درس میں رہ کر اون کی استعداد بھی استاد کے تنگ دائرہ قابلیت کے اندر محدود رہ جاتی، اور اگر وہ ابتدائی مہمات کو بذات خود سر نہ کرتے تو پھر وہ ذاتی سعی کے فن سے ہمیشہ نا آشنا رہتے، غیروں کی دستگیری کے خوگر ہو جاتے اور علم کی اس لقا ووق وادی کو کبھی طے نہ کر سکتے، جس کی "منزل کہ مقصود ہے پر آج وہ فائز نظر آتے ہیں، پس آج بھی علم و فن کی کٹھن راہ میں صرف اون کو چلنا چاہیے جو اگلوں کے نقش قدم پر تین تنہا چل سکتے ہیں، بلکہ اون سے آگے نکل جانے کی ہمت رکھتے ہیں، علم و فضل کی یادگار چھوڑنا صرف معدودے چند لوگوں کا حصہ ہے، اگر کسی مسئلہ ہم کا حل تمہاری ہمت کے دائرہ سے باہر نہیں تو یقین جانو کہ وہ تمہارے حصارک سے بھی باہر نہیں ہے، اُمید ہمت کی راہ میں شمع کا کام دیتی ہے،

اور انسان کی روح غیر محسوس طور پر اپنے مقاصد کے قالب میں ڈھل جایا کرتی ہے، چنانچہ عظیم الشان مواقع پر عظیم الشان قابلیتوں کے ظاہر و آشکار ہونے کا یہی راز ہے، دنیا کا سب سے بڑا خطیب رومہ کا تفضل بھی تھا اور غالباً دنیا کا سب سے بڑا فلسفی انگلستان کا لارڈ خلیسٹر تھا، اگر اول الذکر کسی یونیورسٹی کا پروفیسر ہوتا یا آخر الذکر کسی علمی انجمن کا وظیفہ خواہ ہوتا تو کیا اون کے کارنامے اس قدر بلند و ممتاز ہوتے، فرماؤ اور ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے دربار میں ان لوگوں کو سب سے پہلے جگہ دیں جو اپنے وقت کے صاحب الرائے ہیں، اس نمل خیال کو چھوڑ دینا چاہیے کہ عملی جہان بینی شے دیگر ہے اور زبانی مشورہ و نصیحت سہل ہے، میں پوچھتا ہوں کہ انسان کی طبیعت کو نیکی کی جانب مائل کر دینا مشکل ہے یا اس سے زبردستی کوئی نیک کام کر دینا دشوار ہے، ظاہر ہے کہ دشواری میں اول الذکر کا نمبر بڑھا ہوا ہے، پس چاہیے کہ دربار شاہی اعلیٰ قابلیتوں کا طباؤ مامن بنے تاکہ اہل فضل جنہوں نے اپنی دانائی کی روشنی سے جمالت کی تاریکی کو دور کیا ہے، رفاہ عام میں بھی حصہ لے سکیں اور یہ بجائے خود اون کی جانفشانیوں کا کافی صلہ ہوگا، نیکی، علم اور حکومت کا یکجا ہونا اور خلعت کی سبب وہی میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرنا، یہی ایک صورت ہے جو اعلیٰ و مفید ترین نتائج پیدا کر سکتی ہے،

جب تک قوت و اختیار اور علم و فضل میں جدائی رہیگی، علماء کا مطمح نظر سیاست رہے گا، سلاطین اوالوا العزمی سے مجبور رہینگے اور عوام ذلت و خواری میں پڑے ایڑیاں رگڑینگے،
اب رہے ہم معمولی لوگ جن کے ساتھ استعداد و صلاحیت کی بخشش میں مبدئی فیاض نے سخاوت سے کام نہیں فرمایا ہے، پس ہم کو زیبا ہے کہ گنہامی ہی پر قناعت کریں اور ناموری کو جس کے

ہم اہل نہیں حاصل کرنے میں اپنا وقت ضائع نہ کریں،

اوس شہرت کی ریس کرنا جو ہمارے بس سے باہر ہو یا جو حاصل ہو کر بھی ہماری جانفشانی کی تلافی نہیں کر سکتی، ایک فعل عبث ہے، غیروں کے خیالات سے جلب مسرت کرنا کونسی دانشمندی کی بات ہے جبکہ تلاش کرنے سے خود ہمارے قلب میں بل سکتی ہے، دنیا کو فرض شناسی کی تعلیم دینا اور دن کے لئے چھوڑ دو، تم خود ادا لگی فرض سے کام رکھو، اس سے بڑھ کر سر دست ہم کسی اور تعلیم کے محتاج نہیں ہیں،

اسے نیکی تو جو سادہ لوحوں کے واسطے اعلیٰ ترین علم ہے کیا تجھ سے واقف ہونے کے لئے بھی کسی ریاضت و مشقت کی ضرورت ہے؟ کیا تیرے سادہ اصول بہر قلب پر کندہ نہیں ہیں؟ تیرے تو ان میں جاننے کے لئے سوائے اسکے اور کیا درکار ہے کہ ہم اپنا آپ احتساب کریں اور جذبات کو خاموش کر کے ضمیر کی آواز، کان دیکر سنیں!

یہ وہ سچا فلسفہ ہے جو ہم کو فناء کی تعلیم دیتا ہے، اور ان مشاہیر عالم کی شہرت کی حرص کرنے سے جن کے نام اقلیم ادب میں مرتبہ دوام پر فائز ہیں، باز رکھتا ہے، ہم کو چاہیے کہ بڑوں کی ریس کرنے کی جگہ اپنے اور اون کے درمیان وہ قابل افتخار امتیاز قائم کریں جو سابق میں دو تو مومن کے درمیان تھا یعنی جبکہ ایک کا طرہ امتیاز خوبی کلام تھا تو دوسرے کا طرہ افتخار راضی کروا تھا،

فیضی گمان مبر کہ غم دل نہ گفتہ ماند
اسرار عشق انچہ تو آن گفت گفتہ ایم

قوم ایوب، بنو امیال، اصحاب لرس، اصحاب بجر، بنو قیدار، انصاف اور
 قریش کی تاریخ، اور عرب کی تجارت زبان اور مذہب کی تفصیلی باصطلاح
لغات جدیدہ، چار ہزار جدید عربی لغات کی دستاویزی، ۲۰
دروس لادب، عربی کی پہلی ریڈر طبع سوم مع ترمیم ۲۰
 دوسری ریڈر طبع دوم، ۴

رسالہ اہل سنت والجماعت، ترقی اہل السنۃ والجماعہ کے ہونی
 عقائد کی تحقیق، طبع دوم ۱۰
حیات مالک، امام مالک کی سوانح عمری، مولانا مالک بصرہ
خلافت اور ہندوستان، آغاز اسلام سے اس ملک کی مسلمان
 ہندوؤں کے ساتھ اسلام کا تعلق، مسلمانوں کے سکون اور کثرت، ۲۰
دنیائے اسلام اور خلافت، موجودہ عہد میں خلافت عثمانیہ
 کے قیام بقا کے لیے دنیا کی مسلمانوں میں کیا جدوجہد کر رہی ہیں مصنف

کے سفر یورپ کے دلچسپ مکتوبات ہیں ۶
خلافت عثمانیہ اور دنیا اسلام، اس میں یہ لکھا گیا ہے
 کہ خلافت عثمانیہ نے مسلمانوں اور انسانی ملکوں کی گذشتہ صدیوں
 میں کیا جدوجہدیں انجام دی ہیں، ۴
بہادر جوانین اسلام، مسلمان عورتوں کے جنگی اور فدائی
 بہادری کے کارنامے، طبع سوم، ۴

مولانا عبدالسلام ندوی
اسوۂ صحابہ جلد اول، صحابہ کے عقائد، عبادت، اخلاق
 اور معاشرت کی صحیح تصویر اور ترویج دل کے اسلام کا عملی خاکہ، اسکا
 مطالعہ ہر مسلمان کا فرض ہے، ضخامت ۳۵۰، ۱۰
اسوۂ صحابہ جلد دوم، صحابہ کے سیاسی، انتظامی اور
 علمی کارناموں کی تفصیل، ضخامت ۴۰۰، قیمت ۱۰
القلاب الاحمر، ڈاکٹر لبیان کی مشہور کتاب تو سونکی ترقی
 و تترزل کے قوانین نفسی کا خلاصہ طبع دوم قیمت ۱۰
اسوۂ صحابیات، صحابیات کے مذہبی اخلاقی اور علمی کارنامے
 مرقع، قیمت ۱۰

سیرت عمر بن عبدالعزیز، حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ اموی
 کے سوانح حیات اور ان کے مجد دانہ کارنامے طبع دوم قیمت ۱۰
مولوی عبدالباری ندوی
برکے اور اسکا فلسفہ، مشہور نفا سفر برکے کے حالات زندگی
 اور اسکے فلسفہ کی تشریح، مجلہ عالمی غیر مجلد ۱۰

مبادی علم انسانی، مادیت کی تردید میں برکے کی مشہور
 کتاب پر سنسپل آن ایومون ناچ کا نہایت فہمیدہ اور سنجیدہ ترجمہ
 جس میں جو اس انسانی رحمت کر کے مادیت کا ابطال کیا گیا ہے
مولوی عبدالماجد ندوی
شہنومی بجز انجبت، شہنومی کی ایک یا ب شہنومی سے
 سوانح مصحفی، ۱۲

فلسفہ جذبات، جذبات انسانی کی نفسیاتی تشریح، ۱۰
سیام امین، موسیو چوڑا پال ایک فرانسیسی مصنف کے حوالہ
 دربارہ امن عالم و اخوت انسانی و خون آشامی اور اول برپ کی
 ترجمانی ہے اور اس کے بہ مولوی صاحب شہنومی سے جس میں
 مسائل پر پختل اور قرآن کی تعلیمات کی تفصیل ہے اور دین، بلکہ
 خیالات میں ۱۰۰ صفحے قیمت ۱۰
مکالمات برکے، برکے کے ڈراما گس کا ترجمہ جس میں
 کی صورت میں لکھے نے مادیت کا ابطال کیا ہے، قیمت ۱۰

مولوی سعید صاحب انصاری
تفسیر الواسع، صفحہ ہانی، (عربی) معتزلہ کی مفقود اور نادر
 عقلی تفسیر قرآن کے اجزا جو نہایت دیدہ ریزی سے امام رازی کی
 تفسیر کبیر سے جمع کیے گئے ہیں، عمدہ مانپ میں چھپی ہے قیمت ۱۰
سیر الصحابہ، ازواج مطہرات، نبات طاہرات اور عام صحابہ
 کی سوانح عمری ان کے علمی اخلاقی کارنامے، ۱۰
پروفیسر سید نواب علی ایم اے
معارج الدین، جدید علم کلام پر ایک مختصر تصنیف، ۱۰
 جدیدہ اور مذہب کی باہمی تطبیق پر بہترین تجربہ ۱۰

تاریخ صحف سماوی، تواتر انجیل اور قرآن مجید کی حج
ترتیب کی تاریخ کا بھی موازنہ اور مخالفین اسلام کے اعتراضات

در بارہ منبع قرآن کا جواب جمع اول ہے، دوم سے
سمیع سخن، پروفیسر نواب علی کی اخلاقی، فوجی اور فلسفیانہ نظریوں

کا مجموعہ،
مولوی محمد نوسر حوم قرنگی محلی،

روح الاجتماع، موسیو لیبان کی کتاب جماعت انسان
کے اصول فلسفہ کا اور ترجمہ میں انسانیت جماعت کے اخلاق
پہلے بنیادوں کی خصوصیات اور جماعتوں کے بننے اور بگڑنے کے

قوانین نفسی بیان کیے گئے ہیں صفحہ ۲۳۲
مفتی انوار الحق صاحب ناظم تعلیمات بھوپال

حقائق اسلام، اسلامی مسائل کی فلسفیانہ عقلی تشریح،
مذہب کی باہن، بیچون اور بیچون کی تعلیم کے لیے
رسالہ قوت خیال، دینی اخلاق کے باب میں ایک
مشہور انگریزی رسالہ کا ترجمہ،

اشیات واجب الوجود، یعنی ذات و صفات واجب
الوجود پر عقلی پہلو سے ایک نظر،

تاریخ البوالشیر، کیفیت آغاز نوع انسانی حسب تحقیق
بیبیہ

منشی محمد مہدی صاحب ناظم ہتھم تاریخ بھوپال
انسان، علم خواص الاعضاء کے ابتدائی مسائل سلیس و
عام فہم زبان میں،

رموز فطرت، طبیعیات، طبقات، ارضی بہتیت اور
جو خیر طبیعی کے ابتدائی مسائل عام فہم اور سلیس عبارت میں

منشی محمد امین صاحب ہتھم تاریخ بھوپال
بیمکات بھوپال، مشورہ مجلہ
گیارہ حصے، اخلاقی مسائل شرعی، مذہبی،

نعت پیمبر، عربی، فارسی و اردو کی چند نعتیہ نظموں
کا مجموعہ،

پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی،
الاستدلال، اس میں علم منطقی کے اصول نہایت

حزنی و عمدگی کے ساتھ سلیس زبان و سہل طریقہ سے بیان
کیے گئے ہیں، صفحہ ۲۰۱،

الانسان، اس میں انسان کے تمام قوا کے نفسانی
و جسمانی خصوصیات طبعی کی علمی تشریح کی گئی ہے، صفحہ ۲۰۳

تہسیل البلاغت، اردو زبان میں فن فصاحت و
بلاغت اور بدیع پر دلکش اور سہل اور آسان کتاب ہے

حکمت عملی، فن اخلاق پر جدید و قدیم معلومات کی حالت
کتاب، قیمت

متفرق کتابیں،

یا وایام، مولانا عبدالحی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء نے اس
کتاب میں ہجرت کی اسلامی تاریخ کے مختلف پہلو دکھائے اور

وہاں کے اہل اہل و عیال اور علماء اور مشائخ کے حالات اور علوم
و فنون کی ترقی نہایت تاریخی تہتق و تفصیل سے لکھے ہیں

سیاحت قسطنطنیہ، مولانا شبلی مرحوم کی فرمائش سے
خواجہ سید رشید الدین صاحب مشہور پروفیسر میکن مولر

کے سفر نامہ قسطنطنیہ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے،
بدیہہ گوئی، جناب ہوش بگلرامی نے اس کتاب

میں عربی فارسی اور اردو کے شعراء اور ادیبوں کی بدیہہ
گوئی کے دلچسپ واقعات یکجا کیے ہیں، قیمت

الندوہ، کی جلدین موجود ہیں، قیمت فی جلد
تھے قیمت فی نمبر، یہ نامہ ذخیسہ و کیا ہے،

”منیجر“

آخرى درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آڑہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔
